آخری وعدہ
حمیدی
محی الدین نواب

وعدہ کھوکھلے الفاظ کا نام نہیں بلکہ ایک قرض ہے' وعدہ ایک پُل کی طرح ہے جس سے گزر کر ہم کسی کی شخصیت کا حصہ بنتے ہیں۔

آخری وعدہ

محی الدین نواب

الرفاعی پبلشرز اینڈ بک سیلرز
چوک میوہسپتال نسبت روڈ لاہور

بار اول ـــــ ۲۰۰۱ء
مطبع ـــــ یُواینڈمی پرنٹرز لاہور
قیمت ـــــ -/۱۵۰ روپے

اسٹاکسٹ:-
علی میاں پبلی کیشنز
۲۰- عزیز مارکیٹ، اُردو بازار
لاہور۔ فون: ۷۲۴۷۴۱۴

دیباچہ

کسی نے کہا ہے کہ وعدے کیا ہیں' صرف الفاظ! اور الفاظ کیا ہیں' صرف ہوا! ہوا جو کبھی کسی کو نظر نہیں آتی' ہوا جو کبھی کسی کی گرفت میں نہیں آتی اور۔ جو کبھی رکتی نہیں۔ شاید اسی سے متاثر ہو کر کسی شاعر نے کہہ مارا تھا کہ وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وعدے کی حقیقی تعریف کیا ہے؟

اگر کسی عام انسان سے وعدے کی تعریف کرنے کو کہا جائے تو شاید وہ سوچ میں پڑ جائے' اور بہت سوچ سوچ کر صرف اتنا کہہ سکے کہ وعدہ ایک زبانی تسلی ہے جو سچی بھی ہو سکتی ہے اور جھوٹی بھی۔ بچوں کو کھلونوں سے بہلایا جاتا ہے اور بڑوں کو وعدوں سے۔ لیکن وہ لوگ جو عزت نفس کی اہمیت سے واقف ہیں' ہمیشہ اس تعریف سے اختلاف کریں گے۔

وعدہ کھوکھلے الفاظ کی ترتیب کا نام نہیں بلکہ ایک قرض ہے۔ اس چکائے بغیر خلاصی ممکن نہیں۔ جب کوئی غیور اور خوددار شخص وعدہ کرتا ہے' تو وہ صرف وعدہ نہیں کرتا بلکہ اس کے بدلے اپنا تمام وقار اور عزت اس شخص کے ہاتھ گروی رکھ دیتا ہے جس کے ساتھ وعدہ کیا جاتا ہے۔ وعدہ ایک پل کی طرح ہے جس سے گزر کر ہم کسی کی شخصیت کا حصہ بنتے ہیں' کسی کے دل میں جگہ بناتے ہیں۔ کسی انسان پر اعتبار کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ آپ اس سے وعدہ لیں۔ عقلمند لوگ وعدوں پر اعتبار نہیں کرتے بلکہ اس شخص پر اعتبار کرتے ہیں جس سے وعدہ لیا جاتا ہے۔

وعدے کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ سب سے معروف وعدہ' وعدہ وصال ہے جس پر حسن ہمیشہ چاہنے والوں کو ٹرخاتا رہتا ہے۔ کسی دل جلے نے کہا ہے کہ حسن ہمیشہ وعدے کرتا ہے لیکن دیتا کچھ نہیں۔ شمع روشنی کا وعدہ لے کر آتی ہے' پروانے دیوانہ وار اس

کی طرف بڑھتے ہیں اور جل کر راکھ ہوتے جاتے ہیں۔ اس سے بے خبر کہ جس کے لئے وہ روشنی لینے جا رہے ہیں وہ تو پہلے ہی اپنا گھر منور کر چکی ہے۔ حسن دائمی رفاقت کا وعدہ لے کر آتا ہے اور پھر ایک ابدی فرقت کا تحفہ دے کر چلا جاتا ہے۔ عشق پیشہ کا انجام عموماً خون تھوک تھوک کر مرنا ہوتا ہے۔

لیکن کبھی کبھی ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب حسن کسی دوسرے حسن کے سامنے ہتھیار ڈال کر عشق بن جاتا ہے اور تب وہ ہر وعدہ پورا کرتا ہے۔ اس کی انمول متاع غرور بے دام بک جاتی ہے اور اس کا سر ہمیشہ کے لئے جھک جاتا ہے۔

"آخری وعدہ" بھی ایسے ہی وعدوں کی کہانی ہے۔

یہ ناول محی الدین نواب کی تحریر کے ابتدائی دور کی یادگار ہے' جب ان کا نام اتنا معروف نہیں ہوا تھا کہ پورے ملک کا قاری طبقہ ان سے واقف ہو۔ اس ناول میں اس محی الدین نواب کی بڑی واضح جھلک نظر آتی ہے جسے آگے چل کر قلم کی مملکت کا نواب بننا تھا۔ عطاء الحق قاسمی نے کسی جگہ لکھا ہے کہ کسی بھی مصنف کی پہلی کتاب اس کی بہترین کتاب ہوتی ہے' کیونکہ تب وہ اپنے آپ کو چھوٹا جان کر جی جان سے محنت کرتا ہے۔ جب وہ کتاب چھپ کر مقبول ہو جاتی ہے تو وہ خود کو بڑا رائٹر سمجھنے لگتا ہے اور تب اس کا کام پڑھنے کے لائق نہیں رہتا۔ محی الدین نواب کے ساتھ ایسا تو نہیں ہوا لیکن اتنا ضرور سچ ہے کہ ان کے ابتدائی ناولوں میں شامل یہ ناول ان کے خون جگر سے سینچا گیا ہے۔

یہ ناول آج سے کوئی پچیس سال پہلے شائع ہوا تھا۔ تب محی الدین نواب کا شمار ان لکھنے والوں میں ہوتا تھا جو آگے نکلنے کے لئے جدوجہد کر رہے تھے اور آج ان کا شمار صف اول کے مصنفین میں کیا جاتا ہے۔ اگر آپ اس ناول کا موازنہ ان کی آج کی تحریر سے کریں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ محی الدین نواب نے جس نکتے سے آغاز کیا' اسے عروج پر لے گئے۔ تب کے اور اب کے محی الدین نواب میں بس اتنا ہی فرق ہے۔ اور یہی ان کی کامیابی کا راز ہے۔

"آخری وعدہ" میں آپ کو حسن و عشق کی کشمکش نہیں ملے گی۔ اس میں نہ تو سنگ دل حسینہ ہے اور نہ ناکام عاشق۔ اس میں حسن ہے لیکن مقید اور عاشق ہے لیکن پابند۔

وہ اپنی مجبوریوں کی اسیر اور وہ اپنی روایتوں کا پابند۔ محی الدین نواب نے اس ناول کو غیر ضروری طور پر بہت زیادہ نہیں پھیلایا (حالانکہ ایسا بڑی آسانی سے کیا جا سکتا تھا بس انہیں دیانت فن کی قربانی دینا پڑتی۔) گنے چنے چند کرداروں کو لے کر انہوں نے کہانی کو آگے بڑھایا ہے اور بڑی خوبی سے پورا ماجرا یوں بیان کیا ہے کہ کہیں بھی ان کی گرفت کمزور نہیں ہونے پائی۔

اس ناول کی ایک اور خوبی جس کا میں خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کرنا چاہوں گا' وہ یہ ہے کہ اس کو پڑھتے ہوئے ہر منظر اتنی وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے' کہ آنکھوں کے سامنے تصویر کھنچ جاتی ہے اور کرداروں کا ہر مکالمہ کانوں میں گونجتا ہوا محسوس ہوتا ہے یعنی یوں کہہ لیجئے کہ ناول فلم کی طرح آپ کے ذہن میں چلتا جاتا ہے' آپ کو پتہ بھی نہیں چلتا' آپ کہانی کے سحر میں اس طرح گرفتار ہوتے ہیں کہ جب اختتام ہوتا ہے تو آپ کو ایک دھچکا لگتا ہے اور افسوس ہوتا ہے کہ یہ ناول ختم کیوں ہو گیا' اسے ابھی مزید چلنا چاہئے تھا!

یہ ناول لکھتے وقت شاید محی الدین نواب کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ احساس چھپا بیٹھا تھا کہ آگے چل کر انہیں ایک بہت بڑا نام بننا ہے' اور وہ شروع سے ہی اس نام کی لاج رکھنے کا تہیہ کئے ہوئے تھے۔ "آخری وعدہ" حقیقت میں چند وعدوں کی کہانی ہے' وہ جو پورے ہو گئے اور وہ جو پورے نہ ہو سکے۔ ان سب وعدوں نے مل کر اپنے اسیروں کو کس طرح چکرایا ہے اور کیسی کیسی مشکلات میں گرفتار کیا ہے' اس کا اندازہ آپ اس واقعے سے لگا سکتے ہیں جب ایک حسینہ نے اپنے محبوب سے وعدہ لیا تھا کہ "وعدہ کرو کہ کبھی کوئی وعدہ نہ کرو گے۔"

عظیم احمد

صفدر نڈھال سا ہو کر ایک دوکان کے تھڑے پر بیٹھ گیا۔ وہاں پہلے سے ایک مزدور بیٹھا ہوا تھا اور گرد سے اٹے ہوئے بالوں میں انگلیاں ڈال کر اپنے سر کو کھجا رہا تھا۔

صفدر اپنی دو دن کی بڑھی ہوئی داڑھی کو کھجانے لگا۔ اس وقت ایک مزدور کے قریب بیٹھا ہوا وہ بھی ایک مزدور لگ رہا تھا۔ کپڑے میلے تھے۔ کیچڑ پانی کے باعث پتلون کے پائنچے چڑھے ہوئے تھے۔ لباس پہننے کے انداز میں ذرا سی تبدیلی آ جائے تو آدمی کی شخصیت بدل جاتی ہے۔ دو روز پہلے جب پتلون کے پائنچے اور قمیض کی آستینیں چڑھی ہوئی نہیں تھیں تو وہ ایک معزز شہری نظر آتا تھا لیکن اس وقت تو وہ یا تو آوارہ اور سرپھرا معلوم ہو رہا تھا یا پھر مال و اسباب ڈھونے والا مزدور لگ رہا تھا۔

اس کے سامنے کشادہ سڑک پر رکشے، ٹیکسیاں اور کاریں اِدھر سے اُدھر دوڑ رہی تھیں۔ فٹ پاتھ پر خوش مزاج مرد اور خوش پوش عورتیں ہنسی بولتی گزر رہی تھیں۔ تمام لوگ آسودہ حال نظر آ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ان لوگوں نے زندگی کی تمام خوشیوں کو جیت لیا ہے اور اب اس کا منہ چڑاتے ہوئے گزر رہے ہیں کہ وہ ایک صحت مند نوجوان ہو کر اب تک کچھ بھی حاصل نہیں کر سکا ہے۔ زندگی میں کچھ حاصل کرنا تو بڑی بات ہے وہ تو اس قابل بھی نہیں ہے کہ اپنے لئے ایک وقت کی روٹی حاصل کر سکے۔

اس کا ہاتھ بے اختیار قمیض کی اندرونی جیب کی طرف چلا گیا۔ وہاں ایک تہہ کیا ہوا کاغذ رکھا ہوا تھا۔ وہ کوئی معمولی کاغذ نہیں تھا۔ یہ جرمن ٹیکنیکل کالج سے حاصل کیا ہوا ڈپلومہ تھا۔ یہ ڈپلومہ اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ بہت سے ہنر جانتا ہے۔ اس وقت وہ

چاہے تو کسی موٹر مکینک کے ہاں جا کر ڈینٹنگ کا کام کر سکتا ہے لیکن اس کے باوجود پچھلی رات سے بھوکا تھا اور اس وقت ایک دوکان کے تھڑے پر ایک معمولی مزدور کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔

دو وقت کی بھوک اسے احساس دلا رہی تھی کہ اسے پیٹ کی خاطر کہیں چھوٹا موٹا کام ضرور کرنا چاہئے تھا لیکن ابتدا میں اتنا بڑا ڈپلوما لے کر چھوٹے آدمیوں کی طرح چھوٹا کام کرتے ہوئے کچھ عجیب سی شرم محسوس ہو رہی تھی۔ ہر وقت یہ احساس غالب رہا کہ وہ ایک بہت بڑا انجینئر ہے اور اس کی پہلی آمدنی ہزار روپے مہینے سے کم نہیں ہونی چاہئے۔

علم حاصل کرنے اور ہنر سیکھنے کے دوران ہر شخص یہی خواب دیکھتا ہے لیکن ہر خواب صحیح تعبیر تک نہیں پہنچتا۔ ویسے صفدر کے لیے ایک سنہرا موقع تھا۔ اسے یقین تھا کہ جس دن بھی وہ لاہور گیا' اسی دن سے کمال احمد کی طرح سونے میں تلنے لگے گا۔

کمال احمد اس کے بچپن کا دوست تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد وہ ایک بہت بڑی آئرن فیکٹری کا مالک بن گیا تھا لیکن اس قدر دولت مند ہونے کے باوجود وہ صفدر کو محض دوست ہی نہیں بلکہ سگے بھائی کی طرح چاہتا تھا۔ وہ ہر دوسرے تیسرے ماہ پنڈی آتا تھا۔ کسی کاروباری مقصد کے لیے نہیں بلکہ محض صفدر سے ملنے کے لیے۔ جب بھی وہ یہاں آتا' صفدر کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کرتا لیکن وہ کمال کے ساتھ نہ جا سکا۔ حالات کچھ ایسے تھے کہ وہ دوست کے جذبے کی قدر نہ کر سکا۔

یہاں اس کے سامنے بہت سے مسائل تھے۔ اس کی بیوہ ماں پنڈی چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی۔ مرحوم خاوند کی چھوڑی ہوئی تھوڑی سی زمین جائیداد تھی جس پر بڑا بیٹا' اکبر علی قبضہ جمائے ہوئے تھا۔ چھوٹے بیٹے صفدر علی کے صرف تعلیمی اخراجات پورے ہو جایا کرتے تھے اور اکبر علی کے بگڑے ہوئے تیور بتا رہے تھے کہ وہ صفدر کو اس جائیداد میں سے ایک پائی بھی دینے کا روادار نہیں ہے۔

لیکن ماں کی نظروں میں دونوں برابر تھے' اسی لئے وہ یہاں رہ کر چھوٹے بیٹے کو اس کے جائز حقوق دلانے کی کوشش کرتی رہی تھی لیکن قسمت کو یہ منظور نہیں تھا۔ پچھلے دنوں اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ بھائی اور بھاوج نے لڑ جھگڑ کر اسے نکال دیا۔

صفدر موم کا بنا ہوا نہیں تھا۔ وہ چاہتا تو بھائی کا گریبان پکڑ کر اپنا حق چھین سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ اپنے ڈپلومہ' اپنی صلاحیتوں اور اپنی محنتوں کے بل پر ایک شاندار مستقبل بنانا چاہتا تھا اور اسے یقین تھا کہ اس کا جگری دوست کمال احمد اس سلسلہ میں اس کی بھرپور مدد کرے گا۔

گھر سے نکل کر وہ اِدھر سے اُدھر بھٹکتا رہا۔ کالج سے سرٹیفکیٹ حاصل کرنے میں ایک ہفتہ گزر گیا۔ جب سرٹیفکیٹ ملا تو جیب خالی ہو چکی تھی۔ لاہور جانے تک کا کرایہ نہیں تھا۔ پھر دو وقت کی روٹیاں کھانی مشکل ہو گئیں۔ کہیں وقتی طور پر ویلڈنگ کا کام کرنے میں جھجک سی محسوس ہوتی تھی۔ کئی سالوں کی محنت کے بعد اتنا بڑا ڈپلوما حاصل کر کے وہ معمولی مزدوروں کی طرح محنت نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اب حالت یہ تھی کہ بھوک سے ارے پیٹ کی انتڑیاں کھنچی جا رہی تھیں۔ پہلے وہ نہیں جانتا تھا کہ بھوک کیسی ہوتی ہے؟ اسے پتہ چل رہا تھا' اگر جلدی کہیں سے پیٹ کی آگ نہ بجھائی گئی تو وہ دو قدم چلنے کے قابل بھی نہیں رہے گا۔ آج اسے پتہ چل رہا تھا کہ دو روٹیوں کی خاطر پڑھے لکھے نوجوان بوٹ پالش کیوں کرتے ہیں۔ معمولی مزدوروں کی طرح بوجھ کیوں اٹھاتے ہیں؟ آج وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ وقتی طور پر بھوک کا علاج کرنے کے لیے اسے کہیں نہ کہیں مزدوری کرنی ہی پڑے گی۔

وہ تھڑے پر ایک مزدور کے قریب بیٹھا ہوا یہی سوچ رہا تھا کہ وہ دو روز تک کسی دکان میں ویلڈنگ کا کام کرے گا۔ دو دن میں اتنے پیسے ہو جائیں گے کہ وہ اپنا پیٹ بھی بھر سکے گا اور بس کا کرایہ دے کر لاہور بھی چلا جائے گا۔ ایسا سوچتے ہوئے اس نے کئی بار کوشش کی کہ تھڑے سے اٹھ کر کسی دکان پر چلا جائے اور اپنے لئے کام طلب کرے لیکن بھوک اور نقاہت سے اٹھ نہ سکا۔ پھر یہی خیال اسے پریشان کر رہا تھا کہ کوئی کام دیتے ہی روٹیوں کے پیسے نہیں دے گا۔ پہلے کام کرائے گا' پھر دو چار روپے گن کر اس کے ہاتھ پر رکھے گا۔ اس طرح بہت دیر ہو جاتی۔ اتنی دیر بھوک برداشت کرنے کی سکت نہیں تھی۔ وہ تو کوئی ایسا کام چاہتا تھا کہ محنت کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ہی معاوضہ مل جائے اور وہ اپنے پیٹ کی آگ بجھا لے۔

"قلی!" اچانک کہیں سے آواز آئی۔

صفدر نے سر گھما کر دیکھا۔ ایک شخص بہترین سوٹ پہنے کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے ذرا فاصلے پر ایک بوڑھا مرد ایک بوڑھی عورت اور ایک نوجوان لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔ ان کے اطراف ڈھیر سارے سامان کو دیکھتے ہی صفدر کے قریب بیٹھا ہوا مزدور اچھل کر کھڑا ہو گیا اور تقریباً دوڑتا ہوا ان کے قریب چلا گیا۔

سوٹ پہنے ہوئے شخص نے سرسری نظروں سے صفدر کی طرف دیکھا پھر قلی سے کہا۔

"اتنا سامان تم اکیلے نہیں اٹھا سکتے۔ ایک اور مزدور کو لے آؤ۔"

"کہاں جانا ہے صاحب؟" مزدور نے پوچھا۔

"لاری اڈے!"

"ٹھیک ہے صاحب جی! میں دو پھیرے میں پہنچا دوں گا مگر چار روپے مزدوری ہو گی۔"

"کیا؟" بوڑھی عورت نے حیرت سے چیخ کر کہا۔ "تم لوگ مزدوری کرتے ہو یا مسافروں کو لوٹتے ہو؟"

بوڑھے شخص نے کہا۔

"بھئی اس نے دیکھ لیا ہے کہ ہمارا تانگہ خراب ہو گیا ہے۔ اب تو ہمیں اس کے رحم و کرم پر سامان اٹھا کر لے جانا پڑے گا۔ اسی لئے کھری مزدوری مانگ رہا ہے۔"

نوجوان شخص نے لڑکی کی جانب میٹھی نظروں سے دیکھا مگر لڑکی نے ناگواری سے منہ پھیر لیا۔ اس کی بے رخی دیکھ کر نوجوان شخص نے بڑی فراخدلی سے کہا۔

"کوئی بات نہیں انکل! چار روپے سہی۔ کیا فرق پڑتا ہے۔"

صفدر بیٹھے بیٹھے چونک پڑا۔ چار روپے! یعنی دو وقت کا کھانا۔ گرم چائے کی ایک پیالی اور کیپٹن سگریٹ کا ایک پیکٹ۔ اس کی بھوک اور بڑھ گئی۔ دل نے کہا مزدوری کرنے میں آخر کیا برائی ہے۔ اگر وہ تھوڑی دیر کے لیے بھول جائے کہ وہ ڈپلوما ہولڈر ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ ایک معمولی مزدور بن جائے تو اس ظالم بھوک کو آسانی سے کچل سکتا ہے۔

اس وقت بوڑھی عورت نے صفدر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نوجوان سے کہا۔

"یوسف! میرا خیال ہے کہ اس مزدور کو بھی لگا لیا جائے۔ آدھی مزدوری اسے دے دینا۔ اس طرح ایک ہی پھیرے میں سامان چلا جائے گا۔"

آدھی مزدوری۔ یعنی دو روپے۔ صفدر کے جی میں آیا کہ فوراً ہی اٹھ جائے لیکن نوجوان لڑکی کی نگاہوں نے اسے جکڑ لیا۔ وہ اس انداز میں اسے دیکھ رہی تھی جیسے اسے مزدور نہ سمجھ رہی ہو۔ صفدر سے نظریں ملتے ہی وہ ذرا سی جھجک سی گئی۔ پھر اس نے نظریں جھکا کر بوڑھی عورت سے کہا۔

"ممانی جان! وہ شاید مزدور نہیں ہے۔"

یوسف نے اس کی بات کو اچکتے ہوئے کہا۔

"حامی ٹھیک کہتی ہے آنٹی! اگر وہ مزدور ہوتا تو خود ہی اٹھ کر یہاں آ جاتا۔ آپ ایسا کریں کہ میں حامی کے ساتھ یہاں سامان کے پاس رہتا ہوں۔ آپ اور انکل مزدور کے ساتھ پہلے پھیرے میں چلے جائیں۔"

"نہیں!" حامی گھبرا کر اپنی ممانی کے قریب چلی آئی اور بولی۔ "میں بھی ممانی جان کے ساتھ جاؤں گی۔"

یوسف نے سختی سے اپنے ہونٹوں کو بھینچ لیا اور حامی کو طنزیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ بوڑھے شخص نے بھی گھور کر حامی کو دیکھا پھر یوسف سے کہا۔

"ڈونٹ مائنڈ یوسف! حامی یہاں رہے گی۔ ہم سامان کے ساتھ جاتے ہیں....."

"مم...... مگر...... ماموں جان!"

حامی نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کے ماموں نے غرا کر کہا۔

"بکواس مت کرو۔ کیا یوسف تمہیں کھا جائے گا۔ نان سنس!"

حامی اپنے ماموں کی غراہٹ پر سہم سی گئی۔ یوسف مسکراتے ہوئے قلی کے سر پر سامان رکھنے لگا۔

صفدر بڑی خاموشی سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ان کی باتیں کچھ سنائی دے رہی تھیں اور کچھ ٹریفک کے شور میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ تھوڑی دیر میں حامی کے ماموں اور ممانی قلی کے ساتھ لاری اڈے کی طرف چلی گئیں اور وہ تنہا یوسف کے ساتھ فٹ پاتھ پر کھڑی رہ گئی۔ ان کے قریب ایک سوٹ کیس' ایک بستر اور ایک باسکٹ رہ گئی تھی۔

یوسف نے اسے طنزیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جان من! کب تک مجھ سے کتراؤ گی۔ تمہارے ماموں سے سودا ہو چکا ہے۔ لاہور پہنچتے ہی تم میری ہو جاؤ گی۔"

حامی گھبرا کر اپنے آپ کو دوپٹے میں چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی تھڑے کے قریب آ گئی۔ صفدر اس کے لیے اجنبی تھا لیکن پھر بھی ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہوتا ہے۔ شاید اسی لئے وہ غیرارادی طور پر تھڑے کے قریب چلی آئی تھی۔

یوسف نے بڑی ناگواری سے صفدر کو دیکھا۔ پھر حامی سے دھیمی آواز میں کہا۔

"بہتر یہی ہے کہ ہم آپس میں فرینک ہو جائیں۔ فرینک سمجھتی ہو! نہیں، تم تو انگریزی نہیں جانتی ہو۔ میرا مطلب ہے کہ ہمیں آپس میں بے تکلف ہو جانا چاہیے۔"

حامی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"آپ کو...... راستہ میں کھڑے...... ایسی باتیں کرتے شرم نہیں آتی؟"

یوسف نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تمہیں شرم آتی ہے تو چلو کوئی بات نہیں۔ ہم تنہائی میں بیٹھ کر باتیں کر لیں گے۔"

"میں لعنت بھیجتی ہوئی ایسی تنہائی پر......!"

"لعنت نہ بھیجو۔" اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "اسی تنہائی کے لیے تمہاری بولی دی ہے۔"

حامی شرم سے سرخ ہو گئی پھر وہ دوسری طرف منہ پھیر کر بیک بیک رونے لگی۔

صفدر تھڑے سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔

پھر وہ دو قدم آگے بڑھ کر یوسف کے سامنے آ گیا اور بڑی نرمی سے بولا۔ "چلیے، میں آپ کا سامان پہنچا دیتا ہوں۔"

یوسف نے اسے گھور کر دیکھا اور حقارت سے کہا۔

"مجھے کسی مزدور کی ضرورت نہیں ہے۔ جاؤ یہاں سے......"

"لیکن مجھے مزدوری کی ضرورت ہے۔"

صفدر کے لہجہ میں ایک چیلنج تھا۔ یوسف نے اسے سر سے پیر تک گھور کر دیکھا۔ صفدر ڈیل ڈول میں اس سے کسی طرح کم نہ تھا۔ کسرتی بدن، چٹان جیسا چوڑا سینہ۔ پھر یہ دو دن کی بڑھی ہوئی داڑھی میں اس کے چہرے کی سختی کچھ اور نمایاں ہو گئی تھی۔

یوسف نے پینترا بدل کر سخت لہجہ میں کہا۔

"جانتے ہو، میں کون ہوں؟ یہاں کے بڑے بڑے غنڈے میرے نام سے کانپتے ہیں۔"

"کانپتے ہوں گے۔" صفدر نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "لیکن میں غنڈہ نہیں ہوں۔ ایک شریف آدمی ہوں اور یہ چاہتا ہوں کہ یہ لڑکی تمہارے پاس تنہا نہ رہے۔ اسے لاری اڈے تک پہنچانا میرا فرض ہے۔ عقل سے کام لو مسٹر! خواہ مخواہ دھونس نہ جماؤ۔ یہاں چار آدمی جمع ہو گئے تو وہ لڑکی کی حمایت کریں گے۔"

حامی اپنی آنکھیں پونچھتی ہوئی اس کی طرف احسان مندی سے دیکھنے لگی۔

یوسف گہری سوچ میں پڑ گیا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ اگر وہ صفدر سے الجھے گا تو حامی اس کی حمایت ضرور کرے گی اور اس طرح راستہ پر چلتے ہوئے لوگ اسے ہی لعن طعن کریں گے۔

وہ مصلحتاً نرم پڑ گیا اور صفدر سے بولا۔

"اچھی بات ہے۔ سامان اٹھاؤ!"

صفدر اس کے سامان کی طرف بڑھ گیا۔ حامی نے اطمینان کی ایک لمبی سانس لی۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ خدا نے اس کے لیے ایک رحمت کا فرشتہ بھیج دیا ہے۔

☆===========☆===========☆

حامی بس کی کھڑکی سے لگی بیٹھی تھی۔ اس کی دائیں طرف ممانی جان تھیں۔ ممانی جان کے ساتھ یوسف لگا بیٹھا تھا اور ماموں جان اگلی سیٹ پر آرام فرما رہے تھے۔

لاری اڈے پر خاصی چہل پہل تھی۔ پھیری والے بس کے چاروں طرف چکر لگا کر کھانے پینے کی چیزیں بیچ رہے تھے۔ چاروں طرف ایک شور بپا تھا لیکن حامی کھڑکی سے لگی ہوئی اس شور اور ہنگامہ سے دور، سامنے ایک ہوٹل کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ہوٹل کے سامنے ایک کھلی جگہ پر میزیں بچھی ہوئی تھیں اور ان میں سے ایک میز پر صفدر بیٹھا ہوا روٹیاں کھا رہا تھا۔

اس کے کھانے کا انداز کچھ عجیب سا تھا۔ حامی کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کئی دنوں سے بھوکا ہے اور روٹیوں کو سامنے دیکھ کر بغیر چبائے انہیں نگلتا جا رہا ہے۔ بڑھی ہوئی داڑھی، بھوک سے پھیلی ہوئی آنکھیں اور تیزی سے ہلتے ہوئے جبڑے دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کسی جنگل سے آیا ہے اور جانوروں کی طرح جلدی جلدی پتے چبائے جا رہا ہے۔

حامی اسے ہمدردی سے دیکھے جا رہی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے دیکھ دیکھ کر یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ایک بہت بڑا سہارا اس کے قریب ہے۔ حالانکہ ایسا سوچنا حماقت تھی۔ وہ تو ایک وقتی سہارا تھا۔ مزدور کی حیثیت سے آیا تھا اور اپنی مزدوری لے کر سیدھے ہوٹل کی طرف بھاگتا چلا گیا تھا اور اب روٹیوں پر یوں پل پڑا کہ ایک بار بھی حامی کی طرف آنکھ اٹھا کر اس نے دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ تو جیسے ساری دنیا کو بھول گیا تھا۔

حامی کا دل ڈوبنے لگا۔ اسے احساس ہو گیا کہ واقعی وہ ایک وقتی سہارا تھا۔ جب یہ بس چل پڑے گی تو وہ یہیں رہ جائے گا اور وہ آگے بڑھ جائے گی۔ اپنے ماموں اور ممانی کے رحم و کرم پر۔ تمام راستے یوسف کی ہوس بھری نگاہوں کا شکار ہوتی رہے گی اور جب یہ سفر ختم ہو جائے گا اور جب وہ منزل پر پہنچ جائے گی تو اس کی مرضی کے خلاف یوسف سے اس کا نکاح پڑھایا جائے گا۔ نکاح محض دنیا والوں کو سمجھانے کے لیے۔ کیونکہ سودا تو ہو چکا ہے۔ اس کے ماموں اور ممانی کے بس میں ہوتا تو وہ بغیر نکاح پڑھائے اسے یوسف کے حوالے کر دیتے۔

حامی کے دل میں آیا کہ وہ پھر رونا شروع کر دے لیکن وہ پچھلے کئی دنوں سے اپنے رونے دھونے کا انجام دیکھ چکی تھی۔ ماموں اور ممانی کو اس پر ترس نہیں آیا تھا۔ دور کے رشتہ داروں نے بھی یہی کہا تھا کہ ماموں اور ممانی کو تمہاری بھلائی عزیز ہے۔ انہوں نے بچپن سے تمہاری پرورش کی ہے۔ ماں باپ زندہ ہوتے تو وہ بھی اسی طرح تمہارا گھر بسانے کے لیے سوچتے۔ سب نے یہی سوچا' سب نے یہی کہا لیکن کسی نے یہ نہیں کہا کہ یوسف ایک چھٹا ہوا بدمعاش ہے' شرابی ہے' جواری ہے اور کئی بار جیل جا چکا ہے۔ مرد کی برائیاں دیکھی نہیں جاتیں۔ صرف اس کی کمائی دیکھی جاتی ہے اور سب کے سب یوسف کی نوٹوں سے بھری ہوئی جیبوں کو دیکھ کر مطمئن ہو گئے تھے۔

حامی نے اپنے آنسوؤں کو روک لیا۔ صرف آہ بھر کر رہ گئی۔

ماموں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر یوسف کو مخاطب کر کے کہا۔

”نہ جانے یہ بس کب چلے گی؟ میرا تو موڈ آف ہو رہا ہے۔“

یوسف نے ان کے قریب جھک کر آہستگی سے کہا۔

”انکل! یہ لاری اڈہ ہے۔ یہاں کس طرح موڈ ٹھیک ہو گا۔ بوتل بھی باسکٹ کے اندر رکھی ہوئی ہے۔“

ماموں نے سرگوشی میں جواب دیا۔

”تم فکر نہ کرو۔ باسکٹ اٹھا کر چلو۔ ہم کسی ہوٹل کے کیبن میں دو گھونٹ پی لیں گے۔“

”جیسی آپ کی مرضی!“

یوسف ممانی کے پاس رکھی باسکٹ اٹھا کر بس کے باہر جانے لگا۔ ماموں بھی آہستگی سے اٹھ کر پیچھے ہو گئے۔ حامی ان کے ارادوں کو بھانپ گئی تھی کہ وہ کس مقصد کے لیے باسکٹ اٹھا کر جا رہے ہیں۔ ممانی بھی ناگواری سے بڑبڑانے لگی۔

"لعنت ہے ایسے نشہ پر۔ سفر میں بھی چین سے نہیں بیٹھا جاتا......"

یوسف ماموں کے ساتھ باتیں کرتا ہوا ایک ہوٹل کے سامنے آ کر رک گیا۔ سامنے ہی صفدر ایک میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ ایک ملازم اس کے آگے چائے کی پیالی رکھ کر جھوٹی پلیٹیں اٹھا رہا تھا۔

صفدر نے چائے کی پیالی اٹھا کر یوسف کو پکارتے ہوئے کہا۔

"آیئے صاحب جی! چائے کی ایک ایک پیالی ہو جائے۔"

ایک معمولی آدمی کو اس طرح بے تکلف دیکھ کر ماموں کی پیشانی پر شکنیں پھیل گئیں۔

انہوں نے یوسف سے پوچھا۔

"یہ تو شاید وہی مزدور ہے جو ہمارا سامان لے کر آیا تھا۔"

"جی ہاں!" یوسف نے جواب دیا۔ "چھوٹے لوگوں کے منہ نہیں لگنا چاہیے۔ چلئے ہم کسی دوسرے ہوٹل میں چلیں۔"

وہ ماموں کے ساتھ دوسری طرف چلا گیا۔

صفدر نے مسکراتے ہوئے چائے کی ایک چسکی لی تو اسے محسوس ہوا جیسے وہ یک بیک تازہ دم ہو گیا ہے۔ اس نے ترنگ میں آ کر ملازم سے کہا۔

"اوئے چھوٹے! ایک کیپٹن کا سگریٹ پکڑ بے!"

چھوٹے نے فوراً ہی حکم کی تعمیل کی اور ایک سگریٹ لا کر اسے پکڑا دیا۔ ساتھ ہی دیا سلائی دکھا کر سگریٹ بھی جلا دیا۔ صفدر نے ایک لمبا کش کھینچا۔ چائے اور سگریٹ نے اس کی ساری تھکن دور کر دی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ دھواں چھوڑنے لگا۔

اس کے سامنے ملگجا سا دھواں لہرا رہا تھا۔ کسی دوشیزہ کے آنچل کی طرح اور اس کی مست خرامی کی طرح بل کھاتا ہوا ایک طرف جا رہا تھا۔ دھوئیں کی چال کے ساتھ صفدر کی نگاہیں بھٹکتی ہوئی بس کی طرف چلی گئیں۔ پھر وہ ٹھٹک گیا۔

حامی کھڑکی سے لگی اسے دیکھ رہی تھی۔

صفدر بھی اسے یوں دیکھتا رہ گیا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ فٹ پاتھ پر اس لڑکی سے ہمدردی کرتے وقت اس نے نظر بھر کر اسے نہیں دیکھا تھا۔ دل و دماغ پر بھوک غالب ہو تو دنیا کی کوئی خوبصورتی نظر نہیں آتی۔ اس وقت اس نے سوچا تھا کہ یہ لڑکی کسی طرح اپنے سرپرستوں کے پاس لاری اڈے تک پہنچ جائے۔ اس کی مدد کرنے میں اس نے سامان اٹھا کر مزدوری کرنے میں بھی جھجک محسوس نہیں کی تھی لیکن پھر ہوٹل کی اس میز پر پہنچ کر وہ روٹیوں کے سامنے ساری دنیا کو بھول گیا تھا۔ وہ لڑکی بھی یاد نہ رہی تھی جسے وقتی طور پر اس نے سہارا دیا تھا۔

صفدر نے دوسرا کش لیا۔ ذہن کچھ اور کھل گیا۔ آنکھیں کچھ اور روشن ہو گئیں۔ اور وہ لڑکی ایک خوبصورت شعر کی طرح اس کے دل میں اترنے لگی۔ جب پیٹ میں بھوک نہ ہو' ذہن آسودہ ہو اور آس پاس دنیا کی کوئی فکر نہ ہو تو انسان شاعر کے ذہن سے سوچنے لگتا ہے۔

حامی بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ سیاہ روشن آنکھیں' دمکتا چہرہ' تپتے رخسار' سنگترے کی قاش کی طرح رس بھرے ہونٹ اور بھرا بھرا گدرایا ہوا جسم۔ یوسف نے کچھ دیکھ سمجھ کر ہی اس کے لیے بولی دی تھی اور صفدر بھی اسے بے اختیار دیکھے جا رہا تھا۔

وہ کبھی صفدر کو دیکھ رہی تھی اور کبھی کسی انجانے خوف سے سہم کر اپنی ممانی کی طرف بھی دیکھتی جا رہی تھی اور پھر اس نے آہستہ آہستہ جھجکتے ہوئے اپنا ایک ہاتھ کھڑکی سے باہر نکال لیا۔ اس کے ہاتھ کی مٹھی بندھی ہوئی تھی۔

صفدر نے پہلے چوڑیوں سے بھرے ہوئے صاف و شفاف ہاتھ کو دیکھا۔ پھر اس کی مٹھی کی طرف دیکھنے لگا۔ مٹھی آہستہ آہستہ کھلنے لگی۔ جیسے کنول کھلتا ہے یا پھر جیسے کسی کا نرم و نازک ہاتھ مصافحہ کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ پھر اس کی ہتھیلی سے ایک مڑا تڑا سا کاغذ گولی کی صورت میں لڑھکتا ہوا نیچے مٹی میں گر پڑا۔

صفدر یک بیک اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس لڑکی نے کچھ اس انداز میں اسے دیکھتے ہوئے اپنی مٹھی کھولی تھی اور کاغذ کی گولی کو زمین پر گرایا تھا جیسے کہہ رہی ہو کہ آؤ اور اس مٹی میں پڑے ہوئے تحفہ کو اٹھا لو۔

صفدر کبھی مٹی میں پڑی ہوئی سفید چیز کو دیکھ رہا تھا اور کبھی حامی کو ٹٹولتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ حامی کی خاموش نگاہوں میں اب بھی وہی سوال تھا۔ "کیا تم آگے نہیں بڑھو گے؟"

صفدر تیزی سے کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔ کھانے کے پیسے ادا کیے۔ ہوٹل سے باہر آیا اور اِدھر اُدھر محتاط نظروں سے دیکھنے لگا۔ آس پاس بہت سارے لوگ تھے لیکن اپنے آپ میں مگن تھے۔ کسی کو اس بات کا علم نہ ہو سکا کہ ایک انجانا سا تحفہ ستارے کی طرح آسمان سے ٹوٹ کر مٹی میں آیا ہے اور صفدر کا انتظار کر رہا ہے۔

وہ نپے تلے قدموں سے چلتا ہوا بس کے قریب آیا۔ حامی جلدی سے سر پر آنچل رکھ کر اپنی ممانی کی طرف پلٹ گئی۔ صفدر نے جھک کر کاغذ کی گولی اٹھالی اور خاموشی سے سر کھجاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

کچھ دور جا کر اس نے کاغذ کو کھول کر دیکھا۔ اس ننھے سے پرزے پر ایک ننھی سی تحریر تھی۔

"خدا کے لیے میری مدد کرو۔ ورنہ میں مرجاؤں گی......"

صفدر کے ذہن میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ عجیب تحریر تھی' عجیب التجا تھی۔ ایک اجنبی لڑکی نے ایک اجنبی مرد سے مدد مانگی تھی۔ مدد مانگنے کے لیے شناسائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کوئی رشتہ ضروری نہیں ہوتا۔ صرف ایک انسانی ہمدردی کے تحت مانگی جاتی ہے۔ ایک مظلوم کسی ظالم سے ہمدردی کی توقع نہیں کرتا بلکہ اپنے ہی جیسے مظلوم اور غریب انسان سے امیدیں وابستہ کرتا ہے۔

حامی نے بھی صفدر سے ایک ذرا سا سہارا پانے کے بعد یہی فیصلہ کیا تھا کہ کوئی غریب آدمی ہی اس کے دکھ درد کو سمجھ کر اس کی مدد کر سکتا ہے۔

لیکن وہ کس قسم کی مدد چاہتی تھی؟

صفدر الجھن میں پڑ گیا۔ وہ اس لڑکی کے سامنے جا کر یہ نہیں پوچھ سکتا تھا کہ وہ کس قسم کا سہارا چاہتی ہے؟ اپنے سرپرستوں کے ساتھ رہ کر آخر وہ اتنی مجبور کیوں ہے کہ اس نے مدد بھی مانگی ہے تو نہایت ہی رازدارانہ انداز میں...... اس طرح تحریری پیغام بھیجنے کا مطلب یہی تھا کہ وہ رازدارانہ انداز میں اس کی ضرورت محسوس کر رہی ہے۔

صفدر اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا کہ وہ لڑکی کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ اور کہاں جانا چاہتی ہے؟ پھر وہ بس میں بیٹھی اس اجنبی لڑکی کے لیے کیا کر سکتا تھا؟

ہاں' اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ بھی بس میں بیٹھ جاتا۔ اس کا ہم سفر بن جاتا اور کوئی مناسب موقع ملتے ہی اس کے حالات معلوم کرنے کی کوشش کرتا۔ اس طرح ایک اور فائدہ ہو جاتا کہ وہ اس بس میں بیٹھ کر لاہور پہنچ جاتا پھر کمال کے پاس پہنچتے ہی اس کی ساری پریشانیاں دور ہو جاتیں۔

اسے لاہور جانا تھا۔ پھر آج ہی کیوں نہ جائے۔ راستے میں ایک مجبور لڑکی کے کام کیوں نہ آئے؟

بہت سے سوالات...... بہت سے فیصلے اس کے ذہن میں چکرا رہے تھے۔

بہرحال فیصلہ یہ تھا کہ اسے لاہور جانا چاہئے اور اسی بس میں جانا چاہئے لیکن ٹکٹ کے پیسے؟

لاہور کا کرایہ تقریباً سات روپے تھا۔ ایسی بدحالی اور فاقہ مستی میں سات روپے کا بندوبست کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا اور یہ کوئی ضروری بھی نہیں تھا کہ جب تک کرائے کی رقم کا انتظام ہوتا' یہ بس اس کے انتظار میں یہاں کھڑی رہتی۔

اپنی بے بسی کے احساس سے اس نے مٹھیاں بھینچ لیں۔

وہ ایک حقیر سا ذرہ تھا۔ کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک فضول سا آدمی تھا۔ صرف سات روپوں کا انتظام نہیں کر سکتا تھا۔ ایک مجبور لڑکی کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اس نے جھنجلا کر اس ننھے سے پرزے کے پرزے پرزے کر دیئے۔

☆===========☆===========☆

صفدر لاری اڈے میں اِدھر سے اُدھر بھٹک رہا تھا اور اپنی مجبوری اور بے بسی کے خیال سے کڑھتا جا رہا تھا۔

مجبور انسانوں کی زندگی میں نہ جانے خوبصورتی کیوں چلی آتی ہے اور جب آتی ہے تو صفدر جیسے لوگ اس کی قدر نہیں کر سکتے۔ حامی زندگی کے ایک قیمتی لمحے کی طرح گزر جانے والی تھی اور وہ اس لمحے کو اپنی گرفت میں نہیں لے سکتا تھا۔ اس کے چاروں طرف مختلف سمت جانے والی بسیں کھڑی تھیں۔ لوگ اپنے اپنے سفر کا آغاز کرنے والے تھے۔ ہر شخص اپنی منزل کی طرف جا رہا تھا اور وہ اپنی منزل سے دور ہو رہا تھا۔

وہ ایک خالی بس کے سہارے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

وہ حامی سے بہت دور چلا آیا تھا لیکن چشم تصور میں اب بھی وہ نظر آ رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی کاجل بھری آنکھیں اسے پکار رہی تھیں۔

"خدا کے لیے میری مدد کرو۔ ورنہ میں مر جاؤں گی....."

وہ ایک پکار تھی' ایک فریاد تھی' اور صفدر جیسے مرد کے لیے ایک چیلنج تھا کہ وہ ایک مجبور لڑکی کی مدد نہیں کر سکتا ہے۔

بعض اوقات مردانگی کے جوہر دکھانے کے لیے بھی پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

دراصل اس کے سامنے فوری مسئلہ لڑکی کی مدد کا نہیں تھا بلکہ پیسوں کا تھا۔ وقت اتنا تھوڑا سا تھا کہ وہ محنت مزدوری کر کے بھی اتنی جلدی سات روپے حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ ایسے وقت کوئی جان پہچان کا آدمی بھی نظر نہیں آتا کہ اس سے قرض مانگ لیا جائے۔

کسی کی جیب سے بٹوہ بھی نہیں گرتا کہ چپکے سے اٹھا کر اپنے کام میں لایا جائے۔ کسی فلمی ہیرو کا کوئی کرتب نہیں آتا کہ بس کی چھت پر جمناسٹک کے تماشے دکھاتا ہوا اپنی ہیروئن کے ساتھ سفر کرتا رہے۔

صفدر اپنا سر جھٹک کر رہ گیا۔ "میں کیوں ایسی احمقانہ باتیں سوچ رہا ہوں۔ اس لڑکی سے میرا کیا رشتہ ہے۔ وہ مجبور ہے تو ہوا کرے۔ سارے جہاں کا درد میرے جگر میں کیوں ہو؟ ایسی خوبصورت لڑکی کی مدد کرنے کے لیے بہت سے منچلے تیار ہو جائیں گے۔ پھر مجھے کیا پڑی ہے کہ میں اس بارے میں سوچوں۔"

وہ اپنے ذہن سے حامی کو جھٹکنے لگا۔

بس سے ٹیک لگا کر کھڑے رہنے میں اسے سکون نہیں ملا۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ آگے گرین ایرو ٹرانسپورٹ کمپنی کا مالک ایک آرام کرسی پر اپنی پھولی ہوئی توند کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے آس پاس بہت سے معزز لوگ بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ ان سے ذرا فاصلے پر ایک لمبی بنچ پڑی ہوئی تھی۔ وہاں ایک پھیری والا نائی اپنے گاہک کی داڑھی بنا کر سامان سمیٹ رہا تھا۔

صفدر بنچ پر آ کر بیٹھ گیا اور اپنی بڑھی ہوئی داڑھی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اپنی کھردری داڑھی پر ہاتھ پھیرتے وقت اسے حامی کا شفاف دودھیا چہرہ یاد آ گیا۔ زندگی میں بہت سے حسین و جمیل چہرے اس کی نظروں سے گزرے تھے لیکن نہ جانے اس لڑکی میں کیا بات تھی کہ وہ ذہن میں نقش ہو کر رہ گئی تھی۔ شاید اس لئے کہ وہ لڑکی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ زندگی میں آج تک کسی لڑکی نے اس کا انتظار نہیں کیا تھا لیکن وہ کر رہی تھی۔

صفدر کو ایک مسرت بھرے لطیف جذبہ کا احساس ہوا۔ اپنی اہمیت کا احساس ہوا کہ کسی کی خوبصورت آنکھیں صرف اس کی راہ تک رہی ہیں۔ وہ ہر آہٹ پر چونکی ہوں گی۔ بس میں ہر آنے والے کو صفدر سمجھ کر دیکھتی ہوں گی پھر مایوس ہو کر سر جھکا لیتی ہوں گی۔

وہ بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ اسی وقت نائی نے ایک چھوٹا سا آئینہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے چونک کر نائی کو دیکھا پھر آئینہ میں اپنی شکل دیکھی۔ چہرے پر عجیب سی وحشت تھی۔ اسے خود ہی اپنی شکل اجنبی سی لگی۔

اس نے اپنی جیب ٹٹول کر دیکھا۔ ایک چونی نکال کر نائی کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔

"لو' یہ بھی کیوں رہے۔ کم از کم آدمی تو نظر آؤں۔"

نائی ہنستے ہوئے اپنے بکس سے تولیہ نکالنے لگا۔ صفدر نے بھی دل میں کہا۔

"اچھا ہے۔ جب تک داڑھی صاف ہوگی' اس وقت تک بس بھی چلی جائے گی۔ پھراس کے گم ہونے کا پچھتاوا رہ جائے گا اور پھر یہ پچھتاوا بھی آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گا۔ میں نے زندگی کی کتنی ہی ناکامیوں کو بھلا دیا ہے۔ یہ ناکامی بھی ایک داغ بن کر رہ جائے گی۔"

وہ سوچتا رہا اور نائی اس کی داڑھی صاف کرتا رہا۔ اس سے ذرا فاصلے پر بیٹھے ہوئے لوگ ابھی تک گرما گرم بحث میں الجھے ہوئے تھے۔

پھر صفدر کو پتہ چلا کہ وہ بسوں کی آمدورفت کے متعلق بحث کر رہے ہیں تو وہ توجہ سے ان کی باتیں سننے لگا۔ ایک شخص کہہ رہا تھا۔

"میں کہتا ہوں کہ سیلاب کی خبروں سے خواہ مخواہ دہشت طاری کی جا رہی ہے۔ ہمیں بسوں کو نہیں روکنا چاہئے۔ آگے راستہ ٹھیک ہے۔ اگر ٹھیک نہ ہوتا تو نیو خان کی بسیں وہاں سے نہ آتیں۔"

دوسرے نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

"نیو خان کے ڈرائیور نے ہی یہ خبر سنائی ہے کہ چناب کا پانی بڑھ رہا ہے۔ راستے کے چھوٹے چھوٹے پل ڈوبنے ہی والے ہیں۔"

پہلے آدمی نے جھلا کر کہا۔

"ڈوبنے والے ہیں مگر ڈوبے تو نہیں ہیں۔ وقت سے پہلے ہی دہشت زدہ کر رہے ہو۔ یہ نہیں سوچتے کہ بسیں اس طرح کھڑی رہیں تو ہزاروں روپے کی آمدنی ماری جائے گی۔ ملازموں کی تنخواہیں' انکم ٹیکس والوں کی رقمیں اور ٹریفک پولیس کو رشوتیں اپنی جیب سے دینا پڑیں گی۔"

آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے توند والے نے کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمارا بڑا نقصان ہو رہا ہے۔ بھئی میری سترہ سو ستائیس جانے

کے لیے بالکل تیار کھڑی ہے۔ میں اسے چلتا کرتا ہوں۔"

سترہ سو ستائیس اسی بس کا نمبر تھا جس میں حامی بیٹھی ہوئی تھی۔ صفدر اس نمبر کو سنتے ہی چونک پڑا۔ حامی کا چہرہ پھراس کی نگاہوں میں طلوع ہو گیا تھا۔

اس نے اپنے چہرے کو صاف کرنے کے بعد تولیہ کو ایک طرف رکھ دیا۔ نائی اپنے کام سے فارغ ہو کر اپنا سامان سمیٹ رہا تھا۔

اسی وقت توند والے کے قریب بیٹھے ہوئے ایک نوجوان نے کہا۔

"دراصل انتظامیہ کی کارکردگی ٹھیک نہیں ہے۔ ایسے حالات میں ہمیں پل پل کی خبر ملنی چاہئے کہ ٹرانسپورٹ سروس کے لیے کہاں کہاں سے راستے بند کئے گئے ہیں لیکن کہیں سے کوئی اطلاع نہیں مل رہی ہے۔ سب کے سب ناکارہ ہیں۔ ہمارے ملک میں یہی ہو رہا ہے کہ پڑھے لکھے لوگ سڑکوں پر مارے مارے پھرتے ہیں۔ جاہل اور ناتجربہ کار لوگ افسر بن کر بڑی بڑی تنخواہیں لیتے ہیں۔"

اس نوجوان کی باتیں ختم ہوتے ہی اچانک صفدر کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ بھی تو تعلیم یافتہ ہو کر مارا مارا پھر رہا تھا۔ حالات نے اسے اس قدر بے بس کر دیا تھا کہ وہ ہر اعتبار سے قابل ہونے کے باوجود ضرورت کے وقت صرف سات روپے حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

یکایک اس کے ذہن میں بغاوت ابھری۔ اس نے جوشیلے انداز میں کھڑے ہو کر کہا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ یہاں تعلیم اور ہنر کی قدر کرنے والا کوئی نہیں ہے۔"

سب لوگ اس کی طرف چونک کر دیکھنے لگے۔

"کون ہو تم؟" ایک نے ناگواری سے پوچھا۔

وہ تیزی سے چلتا ہوا ان کے درمیان آگیا اور اپنی جیب سے سرٹیفکیٹ نکال کر کہا۔

"میں بھی اس ملک کا ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہوں۔ میرے پاس جرمن ٹیکنیکل کالج کا ڈپلومہ موجود ہے۔ یہ ڈپلومہ آپ کو بتائے گا کہ میں کتنی صلاحیتوں کا مالک ہوں۔"

اس نے ایک سوٹ والے کی گود میں اس ڈپلومہ کو پھینک دیا۔ سوٹ والا اسے

کھول کر پڑھنے لگا۔

صفدر نے چاروں طرف لوگوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن اتنی صلاحیتوں کے باوجود آج میں نے ایک قلی بن کر بوجھ اٹھایا ہے۔ اگر میں لاہور پہنچ جاؤں تو یہ ڈپلومہ مجھے ہزاروں روپے کی ملازمت دلا سکتا ہے لیکن یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ لاہور جانے کے لیے میرے پاس ٹکٹ کے پیسے تک نہیں ہیں۔"

ایک شخص نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بھئی واہ۔ بھیک مانگنے کا اچھا طریقہ نکالا ہے۔"

صفدر نے بھنا کر کہا۔

"قسم خدا کی میں بھیک نہیں مانگتا۔ اگر آپ رحم کھا کر کچھ دینا بھی چاہیں گے تو میں اسے قبول نہیں کروں گا۔ کیونکہ ایک ہاتھ میں سرٹیفکیٹ پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے بھیک مانگنا صرف میری نہیں بلکہ میرے ملک کے تمام تعلیمی اداروں کی توہین ہے۔"

صفدر نے بھیک لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لئے تمام لوگ اسے ایک نئی دلچسپی کے ساتھ دیکھنے لگے۔

اس نے سوٹ والے سے اپنا سرٹیفکیٹ واپس لے کر کہا۔

"میں آپ لوگوں کو صرف یہ حقیقت بتانا چاہتا ہوں کہ سرٹیفکیٹ محض ایک کاغذ کا ٹکڑا نہیں ہے۔ آپ ایک سادے سے چیک پر دستخط کر دیں تو اس کی قیمت ہزاروں اور لاکھوں روپے تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ سرٹیفکیٹ بھی ایک چیک ہے جس پر دستخط کرنے والے نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اس میں میرے مرحوم باپ کے کمائے ہوئے ہزاروں روپے پوشیدہ ہیں۔

"آپ ایک بنک کا کریڈٹ کارڈ لے کر کسی بھی پٹرول پمپ میں یا کسی بھی تفریح گاہ میں اسے کیش کرا سکتے ہیں۔ کیا یہ سرٹیفکیٹ کسی فٹ پاتھ پر بھی کیش نہیں ہو گا؟

"محنت کا سرمایہ وہاں بھی ہے اور محنت کا سرمایہ یہاں بھی ہے۔ پھر آپ لوگ اسے کاغذ کا ایک حقیر سا ٹکڑا کیوں سمجھتے ہیں۔"

سوٹ والے نے متاثر ہو کر کہا۔

"نہیں بھئی' میں اسے کاغذ کا ایک حقیر سا ٹکڑا نہیں سمجھتا۔ تمہارا یہ سرٹیفکیٹ

قابلِ قدر ہے۔"

صفدر نے کھلے ہوئے سرٹیفکیٹ کو بلند کرتے ہوئے کہا۔

"اگر یہ قابلِ قدر ہے تو میں لاہور ضرور جاؤں گا لیکن آپ لوگوں سے بھیک لے کر نہیں۔ میں اس قابلِ قدر سرٹیفکیٹ کو کسی قدر دان کے پاس دس روز کے لیے گروی رکھنا چاہتا ہوں۔ صرف سات روپے میں......"

سب کے منہ حیرت سے کھل گئے۔

پھر سب ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ بولنے لگے۔ کوئی حیرت کا اظہار کر رہا تھا کوئی ہمدردی ظاہر کر رہا تھا اور کوئی اس کا مضحکہ اڑا رہا تھا۔

صفدر نے کھلے ہوئے سرٹیفکیٹ کو لہراتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ میں سے کوئی اسے گروی رکھنے کے لیے تیار نہ ہو تو میں اسے نیلام کرتا ہوں۔ مفلس عورت کی جوانی یا غریب مرد کی صلاحیتیں ہر دور میں نیلام ہوتی ہیں۔

"اس کاغذ کی تحریر کو دیکھئے۔ یہ میرے مرحوم باپ کے پسینے سے لکھی گئی ہے۔ میں اس پسینے کی بولی سے شروع کرتا ہوں۔ سات روپے......

"ان ٹیڑھے میڑھے لفظوں کو دیکھئے۔ ان میں میری بوڑھی ماں کی جھریاں نظر آئیں گی۔ میں ان جھریوں کو نیلام کرتا ہوں۔ سات روپے......

"لوگو! اس کاغذ کے پیچھے کسی کی محبت ہے' کسی کی التجا ہے' کسی کی آنکھیں بے چینی سے انتظار کر رہی ہیں۔ میں اس انتظار کا بھرم رکھنا چاہتا ہوں۔ سات روپے......"

صفدر کو اچانک اپنے شانہ پر کسی کا ہاتھ محسوس ہوا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو پھولی ہوئی توند والا ٹرانسپورٹ کا مالک اس کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ اس نے بڑی نرمی سے کہا۔

"اس سرٹیفکیٹ کو اپنے پاس رکھ لو۔ میرا بھی ایک جوان بیٹا ہے۔ خدا نہ کرے کہ اس پر بھی ایسا برا وقت آئے۔ جاؤ سترہ سو ستائیس میں جا کر بیٹھ جاؤ۔"

"نہیں سیٹھ صاحب!" صفدر نے کہا۔ "میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ بھیک نہیں لوں گا اور نہ ہی کسی کی ہمدردی سے فائدہ اٹھاؤں گا۔ آپ اس کاغذ کی بولی دیجئے یا پھر اسے سات روپے میں گروی رکھ لیجئے۔"

"تم ضدی اور جذباتی نوجوان ہو...... اور یہ اچھی بات نہیں ہے۔"

"آپ اسے ضد نہ سمجھیں۔ آپ نے کہا ہے کہ آپ کا بھی ایک جوان بیٹا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ اسے بھی خودداری سکھائیں۔"

ٹرانسپورٹ کا مالک اسے تعریفی نظروں سے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ سے سرٹیفکیٹ لے لیا اور کہا۔

"اچھی بات ہے۔ یہ سات روپے میں میرے پاس امانت کے طور پر رہے گا۔ تم لاہور سے سات روپے منی آرڈر کر دینا۔ میں اسے ڈاک کے ذریعے تمہارے پاس بھیج دوں گا۔"

تمام لوگ اس سودے بازی کو خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ ٹرانسپورٹ کے مالک نے ایک ملازم کو آواز دے کر کہا۔

"چھوٹے، چل ادھر آ۔ صاحب کو سترہ سو ستائیس میں لے جا کر بٹھا دے۔"

☆-----------☆-----------☆
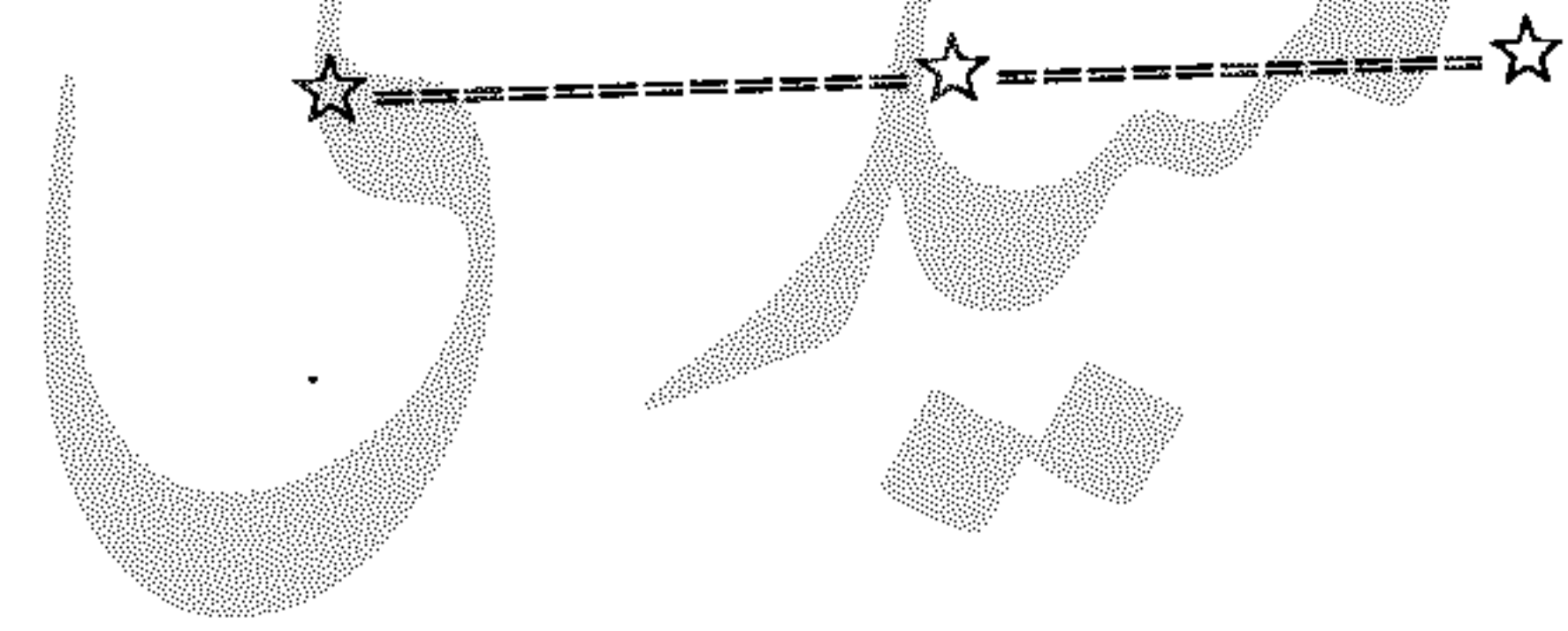
بس کا انجن سٹارٹ ہو چکا تھا۔

ڈرائیور ہارن دے رہا تھا' کنڈیکٹر بس کی باڈی پر ہاتھ مار مار کر مسافروں کو پکار رہا تھا۔ مختلف ہوٹلوں میں گپ مارنے والے مسافر بھاگے بھاگے آ رہے تھے اور بس میں اپنی اپنی جگہ قبضہ جما رہے تھے۔

پھر مسافروں کے اس ریلے میں صفدر بھی آ گیا۔ وہ بس کے دروازے پر ایک ساعت کے لئے ٹھٹکا' حامی کی نگاہوں سے اس کی نگاہیں ملیں اور پھر وہ اپنے لئے جگہ تلاش کرنے لگا۔

حامی پہلے ایک لحہ میں اسے پہچان نہ سکی تھی۔ کیونکہ پہلے اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ بش شرٹ کی آستینیں اور پتلون کے پائنچے چڑھے ہوئے تھے۔ پہلے وہ سڑکوں پر مارا مارا پھرنے والا ایک مزدور دکھائی دیتا تھا لیکن اب تو اس کا حلیہ ہی بدل گیا تھا۔ کلین شیوڈ چہرہ' سلجھے ہوئے بال' بشرٹ کی آستینیں اور پتلون کے پائنچے بھی درست ہو گئے تھے۔ مرد کے چہرے پر جھاڑ جھنکاڑ نہ ہو اور کپڑے بھی سلیقہ سے پہنے گئے ہوں تو اس کا مردانہ حسن آپ ہی آپ نکھر آتا ہے۔

پھر دوسرے لمحے حامی نے اسے پہچان لیا۔ وہ ایک اچھے گھرانے کا خوبرو نوجوان نظر آ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ چند گھنٹے پہلے وہ قلی کا کام کر چکا ہے۔

حامی کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوئی اور وہ بے اختیار اسے دلچسپی سے دیکھتی چلی گئی۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس کی

ممانی اور یوسف اس کی نگاہوں کو تاڑ رہے ہیں اور صفدر کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

صفدر اپنے لئے جگہ تلاش کرتا ہوا یوسف کے قریب چلا آیا۔ دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ یوسف اسے غرا کر دیکھ رہا تھا لیکن صفدر کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ تھوڑی دیر تک اسی طرح نگاہوں کا تصادم رہا۔ پھر مسافروں کا ریلا اسے دھکیلتا ہوا آگے لے گیا کیونکہ وہ آمد و رفت کے راستے پر کھڑا ہوا تھا۔

حامی کے پیچھے والی سیٹ پر ایک بڑھیا کھڑکی سے لگی بیٹھی تھی۔ اس کے بازو پر ایک بوڑھا بیٹھا ہوا تھا اور اس کے بازو میں ایک سیٹ خالی پڑی تھی۔ صفدر وہاں بیٹھ گیا یعنی یوسف کی عین پشت پر اسے جگہ ملی تھی۔

یوسف بے چینی سے پہلو بدل کر حامی کو دیکھنے لگا۔ اس وقت حامی ذرا سا رخ بدل کر بیٹھ گئی تھی اور بڑے پیار اور بڑی احسان مندی سے صفدر کو دیکھے جا رہی تھی۔ ممانی نے اسے ٹھوکا دے کر کہا۔

"سیدھی طرح سر جھکا کر بیٹھو۔ ایسی بھی کیا بے حیائی۔ منہ اٹھا کر ایسے دیکھے جا رہی ہو جیسے وہ تمہارا سگا ہے۔"

یوسف نے ممانی کے قریب جھکتے ہوئے حامی کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور نفرت سے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے۔ اس لفنگے سے پرانی جان پہچان ہے۔ کون ہے یہ؟"

حامی نے حقارت سے اسے دیکھا اور منہ پھیر کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

یوسف الجھن میں پڑ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایک معمولی سے مزدور میں حامی اتنی دلچسپی کیوں لے رہی ہے۔ اس کے دیکھنے کے انداز سے جس محبت اور اپنائیت کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس سے یونہی پتہ چلتا تھا کہ وہ بہت پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں' ورنہ چند گھنٹوں کی جان پہچان میں اتنا گہرا ربط کبھی پیدا نہ ہوتا۔ وہ مضطرب ہو کر صفدر کی طرف گھوم گیا اور اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

اسی وقت کنڈیکٹر نے ڈرائیور کی طرف دیکھ کر ہانک لگائی

"چل بے لنگڑے! گاڑی بڑھا دے۔"

بڑی بڑی مونچھوں والے ڈرائیور نے ایکسیلیٹر پر دباؤ ڈال کر گیئر بدلتے ہوئے غصہ سے کہا۔

"ابے او بمبیا! تجھ سے ہزار بار کہا ہے کہ مجھے لنگڑا نہ کہا کر۔ کسی دن تیری بھی ٹانگ توڑ کر رکھ دوں گا۔"

"ہاہاہاہا!" کنڈیکٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "کیسا مسکری (مسخری) کرتا ہے۔ اپن بمبئی کا رہنے والا ہے۔ ادھر سے کوئی فالتو ٹانگ لے کر نئی آیا ہے کہ تم توڑ دے گا۔"

ایک داڑھی والے بزرگ نے انہیں ڈانٹ کر کہا۔

"ارے نیک بختو! بسم اللہ پڑھ کر گاڑی چلاؤ۔ تم لوگ تو سفر کا آغاز ہی لڑائی جھگڑے سے کر رہے ہو۔ خدا ہی خیر کرے۔"

یوسف نے صفدر کو دیکھ کر دانت نکالتے ہوئے بڑی سفاکی سے کہا۔

"ہاں۔ سفر کا آغاز لڑائی جھگڑے سے ہو رہا ہے۔"

"ہاں۔" صفدر نے جواب دیا۔ "بزدلوں کو اپنے انجام کی خیر منانا چاہئے۔"

یوسف دانت پیس کر اسے دیکھنے لگا۔ کنڈیکٹر آواز لگاتا ہوا آ رہا تھا۔

"کوئی بگیر ٹکٹ (بغیر ٹکٹ والا) بھائی میرے کو بلا کے ٹکٹ لے لو۔"

گاڑی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی لاری اڈے سے نکل رہی تھی۔ کنڈیکٹر نے صفدر کے قریب آ کر کہا۔

"ارے بھائی! تم ادھر میں بیٹھا ہے۔ صاحب نے میرے کو بول دیا ہے کہ تم کو آرام سے لے جاؤں۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

"صفدر!"

صفدر کا نام سن کر حامی نے اسے پلٹ کر دیکھا۔ اسے ایک نظر دیکھ کر مسکرائی اور پھر پہلے کی طرح گردن جھکا کر بیٹھ گئی۔ صفدر نے بھی اسے چور نظروں سے دیکھا تھا لیکن یہ نظریں کنڈیکٹر سے پوشیدہ نہ رہ سکیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میرا نام عثمان ہے۔ تم ادھر ہوٹل میں بیٹھ کے سگریٹ پیتا تھا۔ میں نے بولا کہ تمہارے لئے سگریٹ لینا چاہئے۔ یہ دیکھو!"

اس نے جیب سے تھری کیسل کا ایک پیکٹ اور ماچس کی ڈبیہ نکالی اور اس کی

طرف بڑھا دیا۔

"یہ کیا ہے۔ میں نہیں لوں گا۔" صفدر نے انکار کیا۔

"ارے کیا مسکری کرتا ہے۔ میں اپنا پیسہ دے کے نئی لایا ہے۔ یہ تو سیٹھ صاحب کے کھاتہ میں لکھے گا۔ سیٹھ صاحب نے بول دیا ہے کہ تم کو کھانے پینے کا تکلیف نہیں ہونا چاہیئے۔"

"تم نے خواہ مخواہ پیسے خرچ کر دیئے۔ میں کسی کا احسان نہیں لینا چاہتا۔"

"ارے تمہارے مگج (مغز) میں بات کیوں نہیں آتا۔ ارے بابا! تم اس کو نئی لے گا تو سیٹھ میرے کو گسا کرے گا۔ میرے کو نوکری سے نکال دے گا۔ ارے کیوں میرا پیٹ میں لات مارتا ہے۔"

آس پاس کے لوگ ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ماموں، ممانی اور یوسف بھی انہیں دیکھ رہے تھے اور حامی بھی بار بار پلٹ کر ان کی باتیں سنتی جا رہی تھی۔

صفدر کے قریب بیٹھے ہوئے بزرگ نے اس سے کہا۔

"سگریٹ لے لو میاں۔ وہ بے چارہ ملازم ہے۔ اس کے سیٹھ نے جیسا حکم دیا ہے، وہ عمل کر رہا ہے۔"

عثمان کنڈیکٹر نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مار کر کہا۔

"ماں کسم میں اپنا جندگی میں ایسا آدمی نئی دیکھا۔ تم لوگ کو نئی مالوم ہے، یہ بہت بڑا آدمی ہے۔ اس کا پاس میں گورمنٹ کا بہت بڑا کاگج (کاغذ) تھا۔ یہ بھائی لاہور جانے کے لیے اس کاگج کو سات روپے میں نیلام بولتا تھا۔ بولو! تم لوگ نے کبھی ایسا آدمی دیکھا ہے۔"

سب اسے حیرت سے دیکھنے لگے۔ ایک شخص نے تعجب سے پوچھا۔

"بھئی تعجب ہے، وہ کس قسم کا کاغذ تھا؟"

اگلی سیٹ سے وہی سوٹ والا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا۔

"میں نے دیکھا ہے۔ وہ جرمن ٹیکنیکل کالج کا ڈپلومہ تھا۔ یہ شخص بہت ہی قابل انجینئر ہے۔ اپنے حالات سے مجبور ہو کر اتنی بڑی سند کو صرف سات روپے میں نیلام کر رہا تھا۔"

یوسف اسے حیرت سے، حسد سے اور نفرت سے دیکھ رہا تھا۔ اسے یہ جان کر صدمہ ہوا تھا کہ وہ ایک معمولی مزدور نہیں ہے۔"

عثمان نے ٹھنڈی سانس لی اور حامی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"محبت کے واسطے آدمی اپنا سب کچھ نیلام بول دیتا ہے۔"

حامی جھینپ کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ صفدر گھبرا کر عثمان کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ عثمان نے ہنستے ہوئے اس کے قریب جھک کر آہستہ سے کہا۔

"ماں کسم، چھوکری ایک دم فسٹ کلاس ہے۔ تم یہ سگریٹ نئی لے گا، تو ابھی میرا جبان (زبان) کھل جائے گا۔ ارے کاہے کو میرا جبان کھولتا ہے۔ میں تیرا دشمن نئی ہے۔ میرے سے دوستی بولے گا تو پھائدے میں رہے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس کی ڈبیہ اس کی گود میں رکھ دی۔

صفدر نے حامی کی طرف دیکھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ مسخرا کنڈیکٹر کوئی ایسی ویسی بات کہے اور حامی بدنام ہو جائے۔ اس طرح یوسف وغیرہ کو بھی اس کے خلاف بولنے کا موقع مل جائے گا۔ لہٰذا عثمان کی زبان کو بند رکھنے کے لیے اس نے مجبوراً سگریٹ کے پیکٹ کو قبول کر لیا۔

عثمان نے خوشی سے لہکتے ہوئے کہا۔

"اے مولا بھائی! کیا لنگڑے کا مافق گاڑی چلاتا ہے۔ دونوں ٹانگ والا آدمی کا مافق دوڑاتا کیوں نہیں۔ ٹھک ٹھک کر چل ناہی گوری....."

اس نے کچھ اس انداز میں مٹک کر کہا کہ بس کے تمام مسافر قہقہے لگانے لگے۔

"اوئے تیرا خانہ خراب ہو۔" مولا بخش نے بڑبڑاتے ہوئے گاڑی کی رفتار بڑھا دی اور پھر ریکارڈنگ کے لیے سوئچ کو آن کر دیا۔

بس کی محدود فضا میں آرکسٹرا گونجنے لگا۔

کچھ لوگ توجہ سے گانا سن رہے تھے اور کچھ لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

حامی سر کو جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ صفدر اپنی سیٹ پر بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔

وہ دونوں بظاہر خاموش تھے اور ایک دوسرے سے دور تھے لیکن گیت کے بول کچھ ایسے تھے کہ وہ خیالات کی دنیا میں ایک دوسرے کے بالکل قریب آ گئے تھے۔

یہ فلمی گانے بھی بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ محبت کے ہر جذبہ پر چسپاں ہو جاتے ہیں۔ ریکارڈ بدلتے جا رہے تھے۔ گانے والے اور گانے والیاں پیار کے جذبوں کو نئے نئے انداز میں پیش کر رہی تھیں۔ کسی گلوکار کی آواز سن کر حامی کو یہی محسوس ہوتا کہ یہ صفدر کی آواز ہے اور وہ گیت کے پردے میں اپنی محبت کا اظہار کر رہا ہے۔ کسی گلوکارہ کی سحر انگیز آواز سن کر صفدر کو یہی محسوس ہوتا کہ حامی اپنے دل کی بات اسے کہہ رہی ہے۔

اور حامی اپنے دل کی بات کہہ رہی تھی۔

"میں نہیں جانتی کہ تم کون ہو لیکن نہ جانے میرے دل میں یہ یقین کیسے پیدا ہو گیا تھا کہ تم میری مدد کر سکتے ہو۔ میں اس یقین کی کوئی نفسیاتی وجہ پیش نہیں کر سکتی۔ تم جو کچھ بھی سمجھ لو لیکن میرا یقین میرے کام آ گیا۔ تم میری توقع سے زیادہ ہمدرد ہو۔ یہ ہمدردی کی انتہا ہے کہ تم اپنی ساری زندگی کی محنت کو سات روپے میں نیلام کر رہے تھے۔ تم میری توقع سے زیادہ ایک ایسے خوبرو نوجوان ہو' جس کے سپنے ہر لڑکی دیکھتی ہے۔ ہائے کیا کروں؟ جب سے تمہیں اس نئے انداز میں دیکھا ہے' دل آپ ہی آپ دھڑکے جا رہا ہے۔ میں تمہاری طرف نہیں دیکھنا چاہتی مگر بار بار پلٹ کر دیکھے جا رہی ہوں۔

"تم بھی تو بار بار مجھے دیکھ رہے ہو۔ میں تمہاری نگاہوں کی اپنائیت کو سمجھتی ہوں۔ لیکن یہ نگاہوں کا تصادم کب تک جاری رہے گا؟ میں بھی لاہور جا رہی ہوں۔ وہیں ہمارے سفر کا اختتام ہو گا اور وہیں ہمارے بچھڑ جانے کی منحوس گھڑی آئے گی۔

"مگر میں نے تم سے اس مختصر سے سفر کا ساتھ نہیں مانگا تھا۔ میں تو زندگی بھر کا ساتھ مانگتی ہوں۔ کیا تم ساتھ دو گے؟؟"

حامی نے اپنی جھکی ہوئی گردن اٹھائی اور صفدر کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

صفدر نے سگریٹ کا ایک کش لیا اور دھوئیں کا بھبکا چھوڑتے ہوئے اسے دیکھا۔
دھوئیں کے ملگجے بادلوں میں حامی کا چہرہ چاند کی طرح روشن تھا۔
صفدر کی خاموش نگاہوں نے کہا۔

"میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو لیکن نہ جانے کیوں تمہیں دیکھ کر یہ محسوس ہوا کہ میں اس دنیا میں تنہا نہیں ہوں۔ میری تنہائیوں کو مٹانے کے لیے تم وجود میں لائی گئی ہو۔ کاتب تقدیر نے تمہیں میرے نام لکھ کر بھیجا ہے اور جب سے مجھے اس بات کا یقین ہوا ہے۔ تب ہی میں نے اپنی ساری زندگی کو تمہارے لئے داؤ پر لگا دیا ہے۔

"میں تمہیں ضرور حاصل کروں گا۔

"تم نے مجھ سے مدد مانگی ہے۔ مجھ سے سہارا طلب کیا ہے اور اب تمہاری پیار بھری میٹھی نگاہوں کو دیکھ کر میں سمجھ گیا ہوں کہ تم مجھ سے زندگی بھر کا سہارا چاہتی ہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے یقین کی لاج رکھوں گا اور زندگی بھر تمہارا ساتھ دوں گا......"

اچانک کرکراہٹ کی آواز سن کر صفدر چونک گیا۔
یوسف اس کی طرف کینہ توز نظروں سے دیکھتے ہوئے ایک لمبے سے چاقو کو کھول رہا تھا۔ چاقو کڑکڑاہٹ کی آواز کے ساتھ کھلتا جا رہا تھا۔
آس پاس کے تمام مسافر اسے سہمی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔
چاقو کا تیز اور نوکیلا پھل چمک رہا تھا لیکن کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ یوسف اپنی گود میں رکھے ہوئے ایک سیب کو اٹھا کر اسے چاقو سے کاٹ کر کھانے لگا۔
یہ صفدر کے لیے ایک خاموش چیلنج تھا۔ وہ بھی سیب کی طرح ٹکڑے ہو سکتا تھا۔

☆-----------☆-----------☆

وہ سرائے عالمگیر پہنچے تو شام کی تاریکی پھیل چکی تھی۔

یہاں بس آدھے گھنٹے کے لیے روک دی گئی۔ تاکہ مسافر کھانے پینے سے فارغ ہو جائیں۔ لوگ بس سے اتر کر قریب کے ہوٹل میں جانے لگے۔ ماموں نے اپنی جگہ سے پلٹ کر یوسف سے کہا۔

"چلو' تمہاری آنٹی اور حامی کے لیے روٹیاں لے آئیں....."

"میرا یہاں موجود رہنا ضروری ہے۔ آپ جا کر روٹیاں لے آئیں۔" وہ اپنی جیب سے روپے نکال کر ماموں کو دینے لگا۔

اسی وقت عثمان کنڈیکٹر نے بس کے دروازے سے چلا کر کہا۔

"ارے صفدر بھائی! تم ادھر میں چپ سے کیوں بیٹھا ہے' ادھر میں آؤ نا!"

صفدر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جانے سے پہلے اس نے حامی پر ایک بھرپور نظر ڈالی۔ وہ سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ صفدر محض یوسف کو جلانے کے لیے حامی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے طنزیہ نظروں سے یوسف کو دیکھا اور تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا عثمان کے ساتھ بس سے باہر چلا گیا۔

یوسف نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"اس کی موت اسے یہاں کھینچ لائی ہے۔"

حامی سہم کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ یوسف خون خرابے کا عادی ہے۔

کسی کو قتل کر دینا اس کے لیے معمولی بات ہے۔ ماموں نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ اس لفنگے سے نہ ہی الجھو تو بہتر ہے۔ لڑکی ہماری ہے' بدنامی بھی ہماری ہوگی۔"

ممانی نے گھور کر حامی کو دیکھا پھر کہا۔

"اسی کی وجہ سے وہ سر پر چڑھتا جا رہا ہے۔ مجھے سب پتہ ہے یہ مسکرا مسکرا کر اسے دیکھتی رہتی ہے۔"

ماموں نے بھی غصہ سے اسے دیکھا۔ پھر اپنی بیگم سے کہا۔

"ذرا صبر کرو۔ یہ سفر ختم ہو جائے۔ پھر میں گھر پہنچ کر اس کی خبر لوں گا' بے شرم کہیں کی۔ ہمیں ذلیل کر رہی ہے۔"

حامی سہمے ہوئے انداز سے ایک طرف سمٹ گئی تھی اور سر جھکائے ان کی لعن طعن سن رہی تھی۔ یوسف نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"چلیے ہم بھی ہوٹل چلیں۔ وہاں سے ان کے لیے روٹیاں بھجوا دیں گے۔"

ماموں اس کے ساتھ بس سے باہر آ گئے۔

باہر ایک میز پر صفدر' عثمان اور ڈرائیور مولا بخش روٹیاں کھا رہے تھے۔ عثمان نے یوسف کو وہاں سے گزرتے دیکھ کر صفدر سے کہا۔

"سالا چھٹا ہوا بدمعاش لگتا ہے۔ تم کو گھڑی گھڑی گھور کے دیکھتا ہے۔ تم بولو تو سالے کا پٹڑا کر دے گا۔"

"نہیں!" صفدر نے جواب دیا۔ "میں لڑائی جھگڑا نہیں کرنا چاہتا۔ وہ خواہ مخواہ میرا دشمن بن گیا ہے۔"

"ارے اپنے آپ دشمن کیسے بنے گا؟ تم ہم سے چھپاتا ہے صفدر بھائی! صاف کیوں نئی بولتا کہ لڑکی کا مامیلہ (معاملہ) ہے۔"

"آں!" صفدر نے چونک کر اسے دیکھا پھر سر جھکا کر مسکرانے لگا۔

ڈرائیور مولا بخش نے اس کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا۔

"دوست! اگر لڑکی بھی تمہیں چاہتی ہے تو پھر پروا نہ کرو۔ وہ بدمعاش تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

عثمان نے میز پر ہاتھ مار کر کہا۔

"ادھر بمبئی میں اپن یہی دھندا کرتا تھا۔ تم پھکر مت کرو، ہم لڑکی کو اٹھا کر تمہارا گھر میں پہنچا دے گا۔"

صفدر نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"تم لوگ اس انداز میں نہ سوچو۔ اس میں لڑکی کی بدنامی ہوگی اور میں اس کی بدنامی کسی صورت گوارا نہیں کر سکتا۔ جب سے میں نے اسے دیکھا ہے مجھے یہی محسوس ہو رہا ہے کہ وہ صرف میری محبت ہی نہیں ہے بلکہ میری عزت بھی ہے۔ میں ایک شریف آدمی ہوں اور شرافت کی حدود میں رہ کر ہی اسے اپناؤں گا۔"

عثمان نے منہ لٹکا کر کہا۔

"جا یار! شراپھت سے کام کرے گا تو نکسان (نقصان) میں رہے گا۔"

"نہیں، مجھے اپنے آپ پر اعتماد ہے۔ جس چیز کو میں حاصل کرنے کا فیصلہ کرتا ہوں، اسے حاصل کر کے رہتا ہوں۔ ویسے فی الحال ایک موقع کی تلاش میں ہوں لیکن وہ موقع نہیں مل رہا ہے۔"

عثمان نے چونک کر پوچھا۔

"کیسا موکا۔ ارے ہم سے بولو نا۔ چھپاتا کیوں ہے؟"

صفدر نے سر جھکا کر ہولے سے کہا۔

"میں ایک بار لڑکی سے تنہائی میں ملنا چاہتا ہوں۔ تاکہ اس کی مجبوریاں معلوم کر سکوں۔"

عثمان نے پھر میز پر ہاتھ مار کر کہا۔

"ارے بس، اتنا سا بات ہے۔ لڑکی کو تم کو اکیلے میں ملے گی۔ جرور ملے گی۔"

صفدر نے حیرت سے پوچھا۔

"کہیں تم کوئی ہنگامہ تو نہیں کرو گے؟"

"ارے ہنگامہ کا ایسی تیسی بولتا۔ تم شریپھ ہے۔ اس لئے ہم شراپھت سے اس کو ملا دے گا۔ یہ عثمان کا جبان ہے۔"

پھر اس نے ڈرائیور سے کہا۔

"یار مولا بھائی، میرا صفدر بھائی بھی کیا یاد کرے گا۔ تم وجیرا باد پار کر کے انجن میں کھرابی کر دو۔ اس کے بعد ہم سمجھ لے گا۔"

صفدر اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا لیکن عثمان نے اس کے بعد کچھ نہیں کہا بلکہ خاموشی سے لقمے توڑ کر کھانے میں مصروف ہو گیا۔

ان سے تھوڑی دور ایک میز پر ماموں اور یوسف بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔

ماموں نے نصیحت کے انداز میں کہا۔

"جھگڑا کرنا بیکار ہے۔ وہ بدمعاش زیادہ سے زیادہ لاہور تک ہمارا پیچھا کرے گا۔ اس کے بعد ہم اسے پتہ بھی نہیں لگنے دیں گے کہ ہم وہاں کس محلے میں رہتے ہیں۔ تم اس کے بارے میں سوچنے کی بجائے یہ سوچو کہ کس طرح حامی کا دل جیت سکتے ہو۔ وہ تمہارے پچھلے رویئے سے بدک گئی ہے۔ اگر تم نرمی سے پیش آؤ گے تو وہ ضرور تمہاری طرف مائل ہوگی۔"

یوسف نے ناگواری سے کہا۔

"میں نے تو کوشش کی تھی کہ وہ پچھلی باتوں کو بھول جائے، میں اس سے نرمی سے باتیں کر رہا تھا مگر وہ کمبخت قلی بن کر ہمارے درمیان آ گیا۔ مجھے اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔"

"صبر کرو بیٹے! لاہور پہنچ کر سب معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔"

یوسف نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"کہیں ایسا نہ ہو کہ لاہور پہنچنے سے پہلے ہی حامی ہاتھ سے نکل جائے۔"

"آں، یہ نہیں ہو سکتا۔"

"ہونے کو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ لاہور پہنچنے سے پہلے مجھے ایک بار حامی سے تنہائی میں باتیں کرنے کا موقع مل جائے۔ مجھے یقین ہے کہ میں اسے اپنی باتوں سے قائل کر لوں گا اور پھر وہ اس لفنگے سے نفرت کرنے لگے گی۔"

ماموں نے پریشان ہو کر کہا۔

"لیکن..... تم اس سے تنہائی میں کس طرح ملو گے؟ حامی اس کے لیے تیار نہ ہوگی۔"

"حامی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ بس میں سفر کرنے والی عورتیں اکثر اپنی ضروریات کے لیے بس سے اتر کر دو چار منٹ کے لیے راستے سے ذرا دور کھیتوں کی طرف جاتی ہیں۔ آپ آنٹی سے کہیں کہ وہ بھی اسی بہانے حامی کے ساتھ بس سے اتر جائیں۔ دو چار منٹ کی بات ہے۔ پھر میں حامی سے خود ہی نمٹ لوں گا۔"

ماموں نے قائل ہو کر کہا۔

"ہاں' ترکیب تو بہت اچھی ہے۔ کیا میں ابھی جا کر تمہاری آنٹی سے کہوں؟"

"نہیں یہاں خاصی چہل پہل ہے۔ اگلے کسی اسٹاپ میں موقع نکالا جائے گا۔"

ماموں نے کھانے سے فارغ ہو کر پانی پیا۔ پھر ڈکار لیتے ہوئے کہنے لگے۔

"چاہے کتنا ہی پیٹ بھر کر کھا لو۔ وہسکی کے بغیر مزہ ہی نہیں آتا۔ بھئی مجھے بھی ایک آدھ گھونٹ کے لیے موقع نکالنا ہی ہوگا۔"

یوسف نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"انکل' وہسکی کے بغیر تو میں بھی خود کو آدھا آدمی سمجھتا ہوں مگر کیا کیا جائے۔ احتیاط لازمی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ نشے کی حالت میں ہم پکڑے جائیں اور پھر گردن چھڑانی مشکل ہو جائے۔"

اسی وقت بس کا انجن سٹارٹ ہو گیا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ممانی اور حامی کے پاس سے کھانے کی خالی پلیٹیں آ گئی تھیں۔ یوسف کھانے کا تمام بل ادا کر کے ماموں کے ساتھ بس میں آ گیا۔

صفدر کے پاس بیٹھے ہوئے بوڑھے مسافر سرائے عالمگیر اتر گئے تھے۔ لہٰذا وہ حامی کے ٹھیک پیچھے کھڑکی کے قریب آ کر بیٹھ گیا تھا۔ یوسف اس بدلی ہوئی پوزیشن کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ صفدر کے وہاں بیٹھنے پر اعتراض بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ خالی سیٹ پر کوئی بھی مسافر آ کر بیٹھنے کا حق رکھتا ہے۔

وہ چند لمحے تک کھڑا سوچتا رہا پھر اس نے بھی اپنی پوزیشن بدل لی یعنی ممانی کے بازو بیٹھنے کی بجائے صفدر کے بازو آ کر بیٹھ گیا۔ ماموں نے بھی اپنی جگہ بدل دی اور اپنی بیگم کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔

ان کے درمیان ایک طویل جنگ جاری تھی لیکن یہ جنگ ایسی سرد اور ایسی خاموش تھی کہ بس کے دوسرے مسافر اب تک اس سے بے خبر تھے۔

پھر عثمان نے بس کی باڈی پر ہاتھ مار کر کہا۔

"چل بھائی لنگڑے۔ ٹرم ٹو۔ کہاں کی چھوکری کہاں کا تو؟"

مسافروں کے درمیان پھر ایک قہقہہ گونجا اور بس چل پڑی۔

یوسف نے پہلو بدل کر صفدر کی طرف رخ کیا۔ پھر پیشانی پر بل ڈال کر پوچھا۔

"تم حامی کے پیچھے کیوں بیٹھے ہو؟"

صفدر نے حامی کی طرف دیکھا پھر سگریٹ کی راکھ جھٹکتے ہوئے کہا

"اچھا تو محترمہ کا نام حامی ہے۔ بڑا عجیب سا نام ہے۔"

"میں تم سے کیا پوچھ رہا ہوں؟" یوسف نے غرا کر کہا۔

"کیا؟"

"یہی کہ تم یہاں کیوں بیٹھے ہو؟"

"یہ جگہ خالی تھی اور اس پر کسی کا نام نہیں لکھا تھا۔ تمہارا اعتراض فضول ہے۔"

وہ ہونٹوں کو سختی سے بھینچ کر صفدر کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے پوچھا۔

"تم آخر ہمارا پیچھا کیوں کر رہے ہو؟"

اس نے سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں یہ خیال کیوں آیا کہ میں تم لوگوں کا پیچھا کر رہا ہوں؟"

سوال ایسا تھا کہ یوسف الجھ کر رہ گیا۔ اس بات کو وہ ثابت نہیں کر سکتا تھا کہ صفدر ان کا پیچھا کر رہا ہے۔ بالآخر اس نے کہا۔

"میں تمہاری نظروں کو پہچانتا ہوں۔ تم حامی میں دلچسپی لے رہے ہو۔"

صفدر نے مسکرا کر کہا۔

"تم بھی تو دلچسپی لے رہے ہو۔"

یوسف نے اپنی ران پر ہاتھ مار کر کہا۔

"وہ میری ہونے والی بیوی ہے۔"

"میں کیسے مان لوں؟"

"اس لڑکی کے ماموں اور ممانی اس بات کے گواہ ہیں۔"

"ان کی گواہی سے کچھ نہیں ہوتا۔" صفدر نے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ لڑکی تمہاری بیوی بننے پر راضی ہے یا نہیں؟"

"ہاں راضی ہے۔"

صفدر نے اس کے قریب جھک کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"پھر وہ مجھے دیکھ کر مسکراتی کیوں ہے؟"

یوسف کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔

"مم...... میں...... تمہارے ٹکڑے کر دوں گا۔"

"کیوں' سیب ختم ہو گئے ہیں؟"

"تم.....!" اس نے غصہ سے مٹھیاں بھینچ کر کہا۔ "تم اسے مذاق سمجھ رہے ہو؟ پنڈی کے بڑے بڑے غنڈے میرے نام سے کانپتے ہیں۔"

"انہیں کانپنے کی بیماری ہوگی۔" صفدر نے کہا۔ "فضول باتوں سے کیا فائدہ؟ تم مجھ سے لڑ سکتے ہو' مگر اپنے نصیب سے نہیں لڑ سکتے۔ ہم دونوں میں سے کوئی یہ نہیں جانتا کہ یہ خوبصورت لڑکی کس کے نصیب میں لکھی ہے۔"

"اچھی بات ہے۔" یوسف نے جھنجلا کر کہا۔ "میں تمہیں دیکھ لوں گا۔"

یہ کہتے ہوئے وہ تن کر بیٹھ گیا۔

صفدر نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ دونوں اپنی جگہ خاموش بیٹھے رہے۔

بس اپنی تیز رفتاری سے بھاگی جا رہی تھی۔

گجرات سے آگے جا کر اس کی رفتار کچھ سست پڑ گئی۔ چناب کا پانی سیلابی صورت میں راستے کے اطراف پھیلا ہوا تھا۔ بس کی ہیڈ لائٹوں میں راستے کے اطراف جہاں تک زمین نظر آ رہی تھی' وہ سب پانی سے لبالب بھری ہوئی تھی۔ اس بات کا بھی خدشہ تھا کہ پانی راستے کے چھوٹے چھوٹے پلوں پر نہ چڑھ آیا ہو۔ اس لئے مولا بخش نے بس کی رفتار سست کر دی تھی۔

آدھ گھنٹے بعد وہ چناب کے پل پر پہنچ گئے۔ پل کے اطراف فوجی نوجوان نظر آ رہے تھے' اور سرخ و سبز روشنی کے ذریعہ گاڑیوں کو گزرنے کا سگنل دے رہے تھے۔

چناب کی لہریں بپھری ہوئی تھیں اور پل کی نچلی سطح کو چھوتی ہوئی گزر رہی تھیں۔

بس کے انجن کا شور کچھ کم نہیں ہوتا لیکن لہروں کا شور اس پر حاوی ہو گیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ابھی پانی کا زبردست ریلا آئے گا اور اتنی لمبی چوڑی بس کو تنکے کی طرح بہا کر لے جائے گا۔

تمام مسافر دم بخود بیٹھے ہوئے تھے اور دل ہی دل میں اللہ و رسول کو یاد کئے جا رہے تھے۔ ممانی نے خوف کے مارے اپنے خاوند کے بازو کو مضبوطی سے تھام لیا تھا۔ ان کے انداز سے یوں ظاہر ہو رہا تھا کہ اگر ڈوبنے کا وقت آیا تو وہ اپنے ساتھ خاوند کو بھی لے ڈوبیں گی۔ انہوں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"مجھے معلوم ہوتا کہ پانی اتنا چڑھ گیا ہے تو میں کبھی نہ آتی۔"

ان کی بات کا کسی نے جواب نہیں دیا۔ حامی اپنی جگہ سہمی ہوئی تھی اور وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے سے کترا رہی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ پل گزر گیا تو اس کی جان میں جان آئی اور وہ دوپٹے سے اپنے چہرے کا پسینہ پونچھنے لگی۔ اسے ابھی اس حقیقت کا علم نہیں تھا کہ وہ تمام مسافروں کے ساتھ سیلابی لہروں کے درمیان آ پھنسی ہے۔ آگے چند فرلانگ کے بعد دو چھوٹے پل تھے۔ پہلے پل سے کچھ فاصلے پر آ کر بس رک گئی۔ اس کے آگے دو بسیں پہلے سے رکی ہوئی تھیں اور پل پر سے گزرنے کے لیے سگنل کا انتظار کر رہی تھیں۔

کئی کئی گھنٹوں کے بعد سگنل مل رہا تھا۔ ایک وقت میں ایک ہی بس کو گزرنے کی اجازت دی جا رہی تھی۔ یعنی ادھر سے ایک بس پل پار کر کے آتی تو ادھر سے ایک بس آگے بڑھ جاتی تھی۔

دو گھنٹے کے بعد سترہ سو ستائیس کو گزرنے کی اجازت ملی۔

یہ پل بھی کسی طرح گزر گیا۔

لیکن دوسرے پل سے گزرنا نصیب نہ ہوا۔ پانی کے شدید بہاؤ سے پل کا درمیانی حصہ ٹوٹ گیا تھا۔ فوجی جوانوں کے سگنل نے اس بس کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔

دو پلوں کے درمیان بس کھڑی ہو گئی۔ اب نہ تو وہ آگے جا سکتی تھی اور نہ پیچھے مڑ سکتی تھی۔ اگرچہ بس کو موڑنے کے لیے کافی جگہ تھی لیکن راستے کے دونوں کناروں کی

مٹی سیلاب کی وجہ سے نرم اور قدرے دلدلی ہو گئی تھی۔ بس کو موڑتے وقت دلدلی زمین میں پہیوں کے دھنس جانے کے امکانات تھے۔ اس کے علاوہ یہ علاقہ فوج کے دائرہ عمل میں تھا۔ مولا بخش سگنل کے بغیر اپنی مرضی سے ڈرائیوری نہیں کر سکتا تھا۔

بس کے تمام مسافر کھڑکیوں اور دروازوں سے باہر دیکھنے لگے۔ تاریکی کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ مولا بخش نے ہیڈلائٹس بجھا دی تھیں۔ پھر اس نے انجن بھی بند کر دیا۔ ذرا دیر کے لیے گہرے سکوت کا احساس ہوا۔ پھر سیلابی لہروں کا شور چاروں طرف سے سنائی دینے لگا۔

دور بہت دور تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر روشنی نظر آ رہی تھی۔ وہاں فوجی جوان اپنے کاموں میں مصروف تھے اور یہاں گہرے اندھیرے میں بس کے مسافر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوششیں کر رہے تھے۔ کبھی کبھی بجلی چمک جاتی تو آسمان پر سیاہ بادل کے ٹکڑے نظر آ جاتے تھے۔

عثمان بس سے اتر کر سڑک پر آ گیا تھا۔ دوسرے چند مسافر بھی سڑک پر آ کر ماحول کا جائزہ لینے لگے۔ پانی راستے سے دور تھا اور راستہ کافی اونچائی پر تھا۔ اس لئے فی الحال سیلاب کی لپیٹ میں آنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ لوگوں کو تسلی ہو گئی۔ وہ سگریٹیں سلگا کر پینے لگے اور آپس میں ہنسنے بولنے لگے۔

بس میں بیٹھی ہوئی ایک عورت نے اپنے خاوند کے کان میں کچھ کہا۔ خاوند اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ عورت بھی اٹھ گئی اور اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی بس سے اتر کر دور سڑک پر چلنے لگی۔

یوسف نے ماموں کو اشارہ کیا۔ ماموں نے اپنی بیگم کو اشارہ کیا اور بیگم حامی کے قریب جھک کر سرگوشی میں کچھ کہنے لگی۔

"نہیں۔" حامی نے کہا۔ "مجھے اندھیرے میں جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔"

"اے لڑکی! میں جو ساتھ چل رہی ہوں۔ ڈر کاہے کا۔ چل نخرے نہ کر۔"

ممانی اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ مجبوراً حامی کو بھی اٹھ کر ان کے ساتھ جانا پڑا۔

وہ دروازے کے پاس جا کر ایک ذرا رکی۔ پلٹ کر صفدر کو دیکھا اور پھر ممانی کے پیچھے بس سے اتر گئی۔

پھر چند لمحوں کے بعد یوسف اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے تنقیدی نظروں سے صفدر کو دیکھا۔ صفدر لاپرواہی سے سگریٹ پھونک رہا تھا۔

یوسف اس کی طرف سے کسی قدر مطمئن ہو کر بس کے باہر جانے لگا۔

☆------------☆------------☆

سڑک پر آکر حامی نے دیکھا کہ آسمان کی وجہ سے اتنی زیادہ تاریکی نہیں تھی جتنی کہ بس کے اندر محسوس ہوتی تھی۔ پاس کھڑی ہوئی ممانی صاف نظر آتی تھی مگر دور کھڑے ہوئے لوگ سائے کی طرح دکھائی دیتے تھے۔

ممانی تھوڑی دیر تک کھڑی سوچتی رہی۔ پھر حامی کا ہاتھ پکڑ کر اس پل کی طرف جانے لگیں جس پر سے ابھی بس گزر کر آئی تھی۔

تھوڑی دور جا کر حامی رک گئی اور پوچھنے لگی۔

"اتنی دور جانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہاں سے اب کوئی مسافر نظر نہیں آ رہا ہے۔"

"مسافروں کا کیا ہے۔" ممانی نے کہا۔ "کوئی بھٹک کر ادھر آ سکتا ہے۔ ذرا اور آگے چلو۔"

وہ اس کا ہاتھ کھینچتی ہوئی چلنے لگی۔

رات' تاریکی' گہرا سناٹا۔ حامی کو ڈر لگ رہا تھا۔ بس اور بس کے مسافر دور دور تک نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس نے اپنا ہاتھ جھٹک کر کہا۔

"میں آگے نہیں جاؤں گی۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔"

ممانی نے اسے گھور کر دیکھا۔ پھر کچھ سوچ کر نرم پڑ گئیں۔

"اچھا' تم یہاں ٹھہر جاؤ۔ میں اس درخت کے پاس جاتی ہوں۔"

انہوں نے ایک درخت کی طرف اشارہ کیا اور آگے بڑھ گئیں۔

حامی سڑک کے کنارے تنہا رہ گئی۔ ممانی شاید درخت سے بھی آگے چلی گئی تھیں کیونکہ اب وہ نظر نہیں آ رہی تھیں۔ کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس سناٹے میں صرف مینڈکوں کے ٹرانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

حامی سے تنہا نہیں رہا جا رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ درخت کی جانب بڑھنے لگی تاکہ ممانی کے زیادہ سے زیادہ قریب رہ سکے لیکن درخت کے پیچھے ممانی نہیں تھیں۔ اس نے گھبرا کر آواز دی۔

"ممانی جان!"

ممانی کی طرف سے جواب نہ ملا۔ البتہ ایک آہٹ سن کر وہ چونک گئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ چند قدموں کے فاصلہ پر ایک سایہ نظر آ رہا تھا۔

"کک..... کون ہو تم؟" وہ بوکھلانے لگی۔

"میں ہوں۔ یوسف!"

وہ قریب آ گیا۔

"کیوں' ڈر گئیں؟"

حامی نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر پوچھا۔

"آپ..... یہاں کیوں آئے ہیں؟"

"تم سے دو باتیں کرنے۔"

"میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔"

"ضد نہ کرو حامی! میں اتنا برا آدمی نہیں ہوں جتنا تم سمجھتی ہو۔"

"ہوں...... برے نہیں ہو۔ اسی لئے اس روز میری عزت سے کھیلنا چاہتے تھے۔"

"اس روز میں نشے میں تھا۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہو گی۔ اسے بھول جاؤ۔ میری محبت کا جواب محبت سے دو میں تمہارے لئے دنیا کی ساری خوشیاں مہیا کر دوں گا۔"

"مجھے دنیا کی ساری خوشیاں نہیں چاہئیں۔ میں پہلے ہی اپنا فیصلہ سنا چکی ہوں۔"

یوسف کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس نے پوچھا۔

"کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟"

"ہاں!"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دو ٹکے کا قلی تمہیں پسند آگیا ہے؟"

حامی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یوسف آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

"تم مجھے بھی پسند کرنے لگو گی۔ میں ایسے بہت گُر جانتا ہوں۔"

وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر کہنے لگی۔

"خبردار! میرے قریب نہ آنا۔ ورنہ میں چیخنے لگوں گی۔"

اندھیرے میں چاقو کی آواز کڑکڑائی۔ دم بھر کے لیے حامی کی سانس رک سی گئی۔

"چیخنے سے پہلے ہی میں تمہارے ٹکڑے کر دوں گا۔" اس نے بڑی سفاکی سے کہا۔

پھر اسے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔

وہ مارے خوف کے تھر تھر کانپ رہی تھی۔

یوسف نے اس کے چہرے پر جھکتے ہوئے کہا۔

"سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلتا۔ لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ عورت کو ایک بار تنہائی میں جیت لو' پھر وہ زندگی بھر کے لیے ہار جاتی ہے۔ آؤ ہم ہار جیت کا کھیل......"

اس کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔ اچانک اسے چاقو والے ہاتھ پر کسی کی مضبوط گرفت محسوس ہوئی۔ پھر اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی کسی نے ایک جھٹکے سے اسے کھینچ کر اپنی ٹانگ اڑا دی۔ وہ اس ناگہانی حملہ سے بوکھلا گیا تھا۔ اس لئے اپنا توازن نہ سنبھال سکا اور راستے کے کنارے کیچڑ اور پانی میں جا گرا۔ چاقو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نہ جانے اندھیرے میں کہاں جا پڑا تھا۔

"میں ٹکڑے کر دوں گا......" وہ غراتے ہوئے اِدھر اُدھر کیچڑ پر ہاتھ مار کر چاقو کو تلاش کرنے لگا۔ مگر چاقو نہیں ملا۔ وہ جھنجلا کر سڑک کی طرف آیا۔ سامنے کھڑے ہوئے سائے نے اچانک لات چلائی۔ یوسف کے منہ پر ایک زبردست ٹھوکر پڑی اور وہ الٹ کر پھر کیچڑ میں چلا گیا۔

وہ ہاتھ پاؤں مارتا ہوا پھر اٹھا۔

"میں جانتا ہوں تم کون ہو۔ قلی کے بچے' میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

وہ لڑکھڑاتے ہوئے کیچڑ سے باہر نکلنے لگا۔

حامی ایک طرف سہمی کھڑی ہوئی تھی۔ یوسف کی زبان سے قلی کا ذکر سن کر اس کا چہرہ کھل گیا۔ کچھ بھی ہو اس نے اجنبی پر اعتماد کیا تھا اور وہ اس اعتماد کا بھرم رکھ رہا تھا۔ اسے بچانے کے لیے کمال چالاکی سے لڑ رہا تھا۔ یعنی آپ سڑک کے کنارے کھڑا ہوا تھا اور یوسف کو کیچڑ سے نکلنے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔

اسی وقت ماموں کی آواز سنائی دی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے۔ ٹھہرو!"

ماموں کی آواز سن کر ممانی بھی دور ایک درخت کی آڑ سے نکل آئیں۔ ماموں نے صفدر کے قریب پہنچ کر کہا۔

تم غنڈے ہو' بدمعاش ہو' میری لڑکی پر ڈورے ڈالتے ہو اور میرے لڑکے کو مارتے ہو۔ میں ابھی تمام مسافروں کو بلاؤں گا اور اس کا فیصلہ کروں گا اور...... اور تمہیں جیل بھجواؤں گا۔"

"یہ جھوٹ ہے۔" حامی نے کہا۔ "میں لوگوں سے کہوں گی کہ بدمعاش یہ نہیں' بلکہ آپ کے یوسف صاحب ہیں۔"

"تو چپ رہ۔" ممانی نے ڈانٹ کر کہا۔

"میں چپ نہیں رہوں گی۔" وہ ممانی سے الجھ پڑی۔

ماموں غصہ میں حامی کی طرف بڑھے۔ اس وقت یوسف پھر ہانپتے' لڑکھڑاتے ہوئے کیچڑ سے نکل کر آ رہا تھا۔ صفدر نے ماموں کو پکڑ کر اس کی طرف دھکا دے دیا۔

"ارے' ارے!" ماموں یوسف سے ٹکرائے اور اسے لئے کیچڑ میں گر پڑے۔

اتنے میں عثمان وہاں آ گیا۔

"ارے بابا۔ ادھر میں دھینگا مشتی ہوتا ہے۔ یہ بڈھا! چپ سے ادھر میں آؤ اور مامیلہ کی بات کرو نئ تو ہم پھوجی بھائی (فوجی بھائی) کو جا کر بولے گا کہ تم اپنے پاس میں دارو کا بوتل رکھتا ہے۔"

ماموں اور یوسف کیچڑ سے نکلتے نکلتے چونک پڑے اور گھبرا کر عثمان کو دیکھنے لگے۔

"آؤ آؤ۔ باہر آؤ۔" عثمان نے کہا۔ "میرا صفدر بھائی شریپھ آدمی ہے۔ تم لوگ بھی شریپھ آدمی کا ماپھق بات کرو۔ دیکھو ہم بس کنڈیکٹر ہے۔ ہمارا نجر بہت تیج ہے۔ ہم جانتا

ہے کہ کون سا مسافر اپنا سامان میں کیا چھپا کے لے جاتا ہے۔ ہم سچی بولتا ہے۔ مسکری نئی کرتا۔ ادھر تمہارا باسکٹ کے پاس میں بھائی کھڑا ہو کے ہے۔ تم ادھر میں جا کے اب باسکٹ کو ہاتھ نئی لگا سکے گا۔"

یوسف سڑک کے کنارے آ کے گر پڑا اور ہانپنے لگا۔ ماموں نے اپنے چہرے سے کیچڑ صاف کرتے ہوئے کہا۔

"اے کنڈیکٹر صاحب! کیوں ہم سے دشمنی کر رہے ہو۔ ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔"

"تم ماسیلہ کا بات کرو۔ ہم دشمنی نئی کرے گا۔"

"کیسا معاملہ؟" ماموں نے پوچھا۔

"دیکھو!" عثمان نے کہا۔ "میرا صفدر بھائی تمہارا چھوکری سے اکیلے میں بات کرنا مانگتا ہے۔ ایکدم شریپھ آدمی کا ماقف بات کرے گا۔ تم لوگ موکا دو۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔" یوسف نے غصہ میں کہا پھر کراہتے ہوئے کھڑے ہونے کی کوشش کرنے لگا۔

"کیسا نئی ہو گا۔ جرور ہو گا۔"

یوسف نے ماموں کا بازو تھام کر کہا۔

"آپ اس کی بات میں نہ آئیں۔ اگر بوتل پکڑی گئی تو میں تھانہ میں کچھ دے دلا کر معاملہ ٹھیک کر لوں گا۔"

عثمان نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیا الو کا ماقف بات کرتا ہے۔ ادھر میں تھانہ پولیس نئی ہے۔ پھوج کا کانون ہے۔ پھوجی بھائی لوگ کچھ نئی سنے گا۔ بوتل دیکھے گا اور تمہارا پتسرا کر دے گا۔"

یوسف کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا کہ فوجی جوانوں کے سامنے رشوت نہیں چلے گی۔ وہ تو جرم کا ثبوت دیکھتے ہیں اور ایسی کڑی سزائیں دیتے ہیں کہ........ وہ سزا کے تصور سے ہی کانپ گیا۔ ماموں بھی خوفزدہ ہو کر عثمان کو رحم طلب نظروں سے دیکھنے لگے۔

بچنے کی ایک ہی صورت تھی کہ ماموں صفدر اور حامی کو تنہائی میں باتیں کرنے کا موقع دے دیں اور یہ ماموں جیسے آدمی کے لیے کوئی شرم کی بات نہیں تھی۔ کیونکہ ابھی

تھوڑی دیر پہلے انہوں نے حامی کو اپنی بیگم کے ساتھ اسی لئے اتنی دور بھیجا تھا کہ یوسف اس سے تنہائی میں باتیں کر سکے۔ اب یوسف نہ سہی' صفدر ہی سہی۔ ان کے لیے کیا فرق پڑتا بلکہ لوگوں کے سامنے عزت رہ جاتی وہ شرابی کی حیثیت سے پکڑے نہ جاتے۔

انہوں نے سر جھکا کر یوسف سے کہا۔

"جھگڑا بڑھانے سے کیا فائدہ۔ اس کی بات مان لینی چاہئے۔"

"مگر....!"

مگر کے بعد یوسف کچھ کہہ نہ سکا۔ اسے پھر خیال آ گیا کہ پل پر فوجی جوان موجود ہیں' یہاں اس کا کوئی ہتھکنڈا نہیں چلے گا۔

وہ غصہ اور بے بسی سے جھنجلانے لگا۔

عثمان نے ہاتھ نچا کر کہا۔

"چلو' چلو۔ ہم لوگ ادھر آگے میں جا کے بیٹھے گا۔ میرا صفدر بھائی شریپھ آدمی ہے۔ تمہارا لڑکی کو بھگا کے نئی لے جائے گا۔ چلو!"

ماموں سر جھکا کر آگے بڑھ گئے۔

یوسف نے حسرت سے حامی کی طرف دیکھا۔ پھر غصہ سے صفدر کو دیکھا۔ وہ دیکھ سکتا تھا مگر ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا۔ ممانی نے آگے بڑھ کر اس سے کہا۔

"چلو۔ غلطی تم لوگوں کی ہے۔ میں نے کئی بار منع کیا ہے کہ گھر سے باہر شراب نہ پیا کرو۔ اب اس کی سزا تو بھگتنا ہی پڑے گی۔"

یوسف ممانی کے ساتھ آہستہ آہستہ بے دلی سے قدم اٹھاتا ہوا جانے لگا۔ عثمان نے کہا۔

"صفدر بھائی! جتنا دیری تم بات کرے سکتا ہے' کرو۔ ادھر میں بس آگے نئی بڑھے گا اور ادھر میں ہم یہ بڈھا بڈھی اور یہ جوان آدمی کا چکا جام کر کے رکھے گا۔ تم پھکر مت کرو۔"

یہ کہہ کر وہ بھی ان کے پیچھے چلا گیا۔

صفدر اور حامی تنہا رہ گئے۔ دو اجنبی' دو شناسا۔ ایک چھوٹے سے سفر میں ایک چھوٹی سی ملاقات کے لیے ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔

حامی سر جھکائے' اپنے دھڑکتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھے خاموش کھڑی ہوئی تھی۔

ایک مرد کے قریب آ کر وہ زندگی میں پہلی بار کسی قسم کا خوف محسوس نہیں کر رہی تھی بلکہ ایک قوت' ایک اعتماد اور ایک مضبوط سہارے کا یقین کر رہی تھی۔

"حامی!" صفدر نے بڑی نرمی سے کہا۔ "پتہ نہیں یہ ملاقات کتنی مختصر ہو گی۔ ہمیں یہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ تم نے مجھ سے مدد مانگی ہے۔ میں ہر طرح سے تمہاری مدد کروں گا۔ تم مجھے بتاؤ کہ تم کہاں جا رہی ہو۔ تمہارے ساتھ ان لوگوں کا کیا رشتہ ہے اور تم اپنے آپ کو اتنی مجبور اور بے بس کیوں سمجھ رہی ہو؟"

حامی نے ایک گہرے سانس لی پھر وہ ہولے ہولے کہنے لگی۔

اس کی آواز میں ترنم بھی تھا' مٹھاس بھی تھی اور آنسوؤں کی نمی بھی۔

میں ایک یتیم لڑکی ہوں اور تقریباً دس برس سے ماموں کے ہاں زندگی گزار رہی ہوں۔

میرے اختیار میں ہوتا تو میں ماموں کے ہاں رہنا کبھی گوارا نہ کرتی کیونکہ اس گھر کا ماحول بڑا ہی گھناؤنا تھا۔ وہاں اکثر گھنگروؤں کی آوازیں گونجتی رہتی تھیں۔ ممانی ایک اسٹیج کی رقاصہ تھیں اسی لئے ڈانس کی ریہرسل کے لیے گھر کو بھی اسٹیج بنا کر رکھ دیتی تھیں۔

ماموں کے دوست جواء کھیلنے کے لیے آتے تھے۔ وہاں وہ شراب بھی پیتے تھے' ممانی کی ریہرسل بھی دیکھتے تھے اور ساری رات واہ واہ کرتے گزار دیتے تھے۔

وہاں میرا دم گھٹنے لگتا تھا۔ میں نے ایک اچھے ماحول میں پرورش پائی تھی۔ میری والدہ' جو کہ ماموں کی سگی بہن تھیں۔ وہ بھی ماموں سے محض اس لئے نفرت کرتی تھیں کہ وہ ممانی سے شادی کر کے غلط راستوں پر چلنے لگے تھے۔ والدہ کا انتقال ہوا تو اباجان نے ماموں کا اپنے ہاں آنا جانا بند کرا دیا تھا۔ کیونکہ وہ ہمیشہ شراب کے نشہ میں ہمارے ہاں آیا کرتے تھے۔

اباجان بیچارے کیا جانتے تھے کہ ان کی آنکھ بند ہوتے ہی یہی ماموں جان مجھے اپنے گندے ماحول میں رہنے پر مجبور کر دیں گے۔ تقدیر کا لکھا پورا ہو کر رہتا ہے۔

۔ جب میں گیارہ برس کی ہوئی تو اباجان کا بھی انتقال ہو گیا۔ میری پھوپھی اور چچا وغیرہ بڑے ہی خودغرض اور مطلب پرست ظاہر ہوئے۔ اباجان کے بعد کسی نے میرا بوجھ اٹھانا گوارا نہ کیا۔ اگر میرے والد رئیس اعظم ہوتے اور میرے لئے ہزاروں' لاکھوں

روپے کی جائیداد چھوڑ کر مرتے تو سب ہی مجھے ہاتھوں ہاتھ لیتے لیکن میرے غریب والدین کے پاس شرافت کے سوا اور کوئی پونجی نہیں تھی۔ اس لئے مجھے کھوٹا سکہ سمجھ کر ہر ایک نے مجھ سے منہ موڑ لیا۔

ایسے وقت ماموں جان آئے اور میرے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیر کر اپنے ساتھ لے گئے۔ میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے وقت بھی ان کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی لیکن اس وقت شرابی ماموں جان میرے لیے دوسرے رشتہ داروں سے بہتر تھے۔ وہ بے مروت نہیں تھے۔ خودغرض نہیں تھے۔ انہوں نے میری یتیمی کا خیال کیا تھا اور میرے سرپرست بن کر مجھے اپنے ہاں پناہ دی تھی۔

میرے دل میں ان کے لیے بہت زیادہ محبت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ میں ایک عرصہ تک ان کی عزت کرتی رہی۔ شراب نوشی کو ان کی کمزوری سمجھ کر نظرانداز کرتی رہی اور اس گھر کے بگڑے ہوئے ماحول کو کسی نہ کسی طرح برداشت کرتی رہی لیکن پھر مجھے آہستہ آہستہ اس حقیقت کا علم ہوتا گیا کہ انہوں نے ممانی کے مشورے پر مجھے اپنے ہاں پناہ دی ہے۔

دراصل ممانی کو اندر ہی اندر اپنے بڑھاپے کا احساس ستا رہا تھا۔ طوائف کی جائیداد اس کی جوان بیٹی ہوتی ہے جو بڑھاپے میں اسے سہارا دیتی ہے۔ ان کی کوئی بیٹی نہیں تھی۔ اسی لئے انہوں نے ماموں جان کو مشورہ دیا تھا کہ وہ مجھے پناہ دیں تاکہ کچھ عرصہ بعد میں جوان ہو کر ان کا سہارا بن جاؤں۔

یہ حقیقت رفتہ رفتہ مجھ پر واضح ہوئی۔ جب ممانی نے ریہرسل کے وقت مجھے اپنے سامنے بٹھانا شروع کیا۔ جب انہوں نے طبلے کی تھاپ پر تا تھئی تا تا تھئی کا درس مجھے دینا چاہا اور جب میں نے ایسا کرنے سے انکار کیا تو غصہ میں دل کی بات زبان پر آ گئی۔

”نمک حرام خور! کیا اسی دن کے لیے تجھے پال رہے ہیں۔ ناچے گی نہیں تو پیٹ کیسے پلے گا۔ تیرا ماموں کام چور ہے۔ بیٹھ کر کھانے کا عادی ہو گیا ہے۔ اس کے لیے شراب کے پیسے کہاں سے آئیں گے۔ چل اٹھ۔ جیسا میں کہتی جاؤں' ویسے ہی کرتی جا۔ تا تھئی تا تا تھئی.....“

لیکن میں نے ناچنے کے لیے قدم نہیں اٹھائے۔ ممانی نے مجھے گالیاں دیں۔ ماموں

نے مجھے خوب پیٹا۔ مجھے سارا دن بھوکا رکھا گیا لیکن میں اپنی ضد پر قائم رہی۔

آخر وہ ظلم کرتے کرتے تھک گئے اور وقتی طور پر خاموش ہو گئے۔

وقت گزرتا گیا۔ میں جوان ہوتی گئی اور ممانی پر بڑھاپا طاری ہوتا گیا۔ وہ اکثر مجھے ایسی نظروں سے دیکھا کرتی تھیں جیسے مالی اپنے لگائے ہوئے درخت کے پھلوں کو دیکھتا ہے۔ دیکھتا ہے اور فیصلہ کرتا ہے کہ پھل ابھی پوری طرح پکے بھی ہیں یا نہیں؟ میں ان کی نگاہوں کا مفہوم نہیں سمجھتی تھی۔ اس لئے میں ان کے ناپاک ارادوں کو نہ بھانپ سکی۔

پھر ایک دن مجھے بتایا گیا کہ میری شادی کی بات طے ہو چکی ہے۔ اس دن ماموں جان تین ہزار روپے لے کر آئے تھے اور بڑی خوشی سے اعلان کر رہے تھے کہ آج رات شوکت سے میرا نکاح ہو جائے گا۔

اس وقت اچانک شادی کا پروگرام سن کر میں پریشان ہو گئی۔

شوکت وہی تھا جو ماموں جان کے دوستوں کے ساتھ اکثر جواء کھیلنے کے لئے ہمارے ہاں آیا جایا کرتا تھا اور جب بھی یہاں آتا تھا تو میٹھی میٹھی نظروں سے مجھے دیکھتا رہتا تھا۔ یوں تو سب ہی دیکھتے تھے۔ دیکھتے نہیں بلکہ گھورتے تھے۔ میں ان کی ہوس بھری نگاہوں سے بچنا چاہتی تھی۔ ان کے سامنے جانے سے کتراتی تھی لیکن ماموں اور ممانی کسی نہ کسی کام کے بہانے مجھے وہاں بلا لیا کرتی تھیں۔

شوکت ان تمام لوگوں سے بہتر تھا کہ اس کے دیکھنے کے انداز میں سستا پن نہیں تھا۔ وہ عجیب حسرت بھری نظروں سے مجھے دیکھا کرتا تھا۔ اس کے ساتھ خود کو منسوب ہوتے دیکھ کر میرے بھی سوچنے کے انداز میں فرق آ گیا۔ میں نے سوچا کسی نہ کسی سے ایک دن منسوب ہونا ہی ہے۔ اس نسبت کا فیصلہ ماموں ہی کر سکتے ہیں۔ اگر انہوں نے شوکت کا انتخاب کیا ہے تو یہ ٹھیک ہی ہے۔ میں کم از کم اس نفرت انگیز ماحول سے باہر چلی جاؤں گی۔

سچ پوچھو تو میں اس گھر سے فرار ہونا چاہتی تھی۔ شرابیوں اور جواریوں کی غلط نظروں سے بچنے کا یہی ایک راستہ تھا کہ میں اپنی عزت کی سلامتی کے لیے چپکے سے کہیں بھاگ جاؤں۔ پھر شادی کے اس فیصلہ نے میرا ارادہ بدل دیا۔ میں نے سوچا کہ بھاگنے سے

بہتر ہے کہ میں شوکت کی دلہن بن کر یہاں سے جاؤں۔

شادی بڑے عجیب انداز میں ہوئی۔ نہ ڈھولک بجا نہ گیت گائے گئے۔ نہ شہنائی گونجی، نہ دھوم دھام سے بارات آئی۔ مجھے بنا سنوار کر اور گھونگھٹ نکال کر اس طرح بٹھا دیا گیا کہ میں ایک شرمیلی دلہن کی طرح سر اٹھا کر کسی کو دیکھ بھی نہیں سکتی تھی۔ میں تو اس قاضی کو بھی نہ دیکھ سکی تھی جو مجھ سے نکاح قبول کرا گیا تھا۔ ویسے میں تو کیا کسی بھی دلہن نے آج تک گھونگھٹ سے سر نکال کر قاضی کا چہرہ نہیں دیکھا ہے۔ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ اس کے متعلق میں نے اس لئے بھی کچھ نہیں سوچا کہ مجھے اس گھر سے نکلنے کے لیے ایک سہارا مل رہا ہے۔

پھر ممانی نے بتایا کہ ابھی کچھ روز تک میری رخصتی نہیں ہوگی۔ دولہا آج رات اسی کمرے میں گزارے گا۔ یہ بات مجھے کچھ عجیب سی لگی۔ مگر بات کتنی ہی عجیب کیوں نہ ہو۔ مجھے ایک بات کا اطمینان تھا کہ میرا نکاح ہو چکا ہے اور کوئی مجھے گنہگار نہیں بنا سکتا۔

میں دلہن بنی گھونگھٹ نکالے بیٹھی رہی۔

تھوڑی دیر بعد کمرے میں کسی کی آہٹ سنائی دی۔ پھر دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ اس کے چند لمحوں بعد میں نے شوکت کی آواز پہچان لی۔

"حمیدہ!" اس نے قریب آکر سرگوشی میں کہا۔ "لوگ تمہیں حمیدہ نہیں بلکہ پیار سے حامی کہتے ہیں لیکن میں حامی کہنے سے پہلے تمہارے پیار کا حق مانگنا چاہتا ہوں۔

"تم نہیں جانتی کہ میں تمہیں کتنی مدت سے چاہتا ہوں۔ تم سے خاموش محبت کرتے ہوئے کئی سال بیت گئے ہیں۔ جب پہلی بار میرا ایک دوست جواء کھیلنے کے لیے مجھے یہاں کھینچ کر لایا تو میرا ارادہ یہی تھا کہ دوست کے اصرار پر صرف آج کھیلوں گا اور کبھی یہاں نہیں آؤں گا۔ مگر یہاں تمہیں دیکھ کر میں دیوانہ ہو گیا۔ یہاں میں نے تاش کی بازی جیتی مگر دل ہار کر چلا گیا۔

"پھر میں تمہاری خاطر یہاں ہر روز آنے لگا۔ رفتہ رفتہ تمہاری حیا بار آنکھوں، جھکی ہوئی پلکوں اور شرمیلی اداؤں سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ تم اس گھناؤنے ماحول سے بالکل برعکس ہو اور کسی وجہ سے یہاں زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئی ہو۔

"میں بھی کوئی برا آدمی نہیں ہوں۔ یہ تو تم نے دیکھا ہی ہے کہ میں کبھی شراب

نہیں پیتا۔ ایک منچلے دوست کے اصرار پر ایک بار جواء کھیلا تو تمہیں بار بار دیکھنے کے شوق میں کھیلتا ہی چلا گیا۔ تمہارے ماموں مجھ سے اس لئے خوش ہیں کہ میں ایک دولت مند ہوں اور یہاں بڑی بڑی رقمیں ہار کر چلا جاتا ہوں۔ مجھے اس بات کی پروا نہیں ہے کہ میں اب تک کتنی رقم ہار چکا ہوں۔ مجھے تو اس بات کی خوشی ہے کہ تمہیں جیتنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

"پھر ایک دن میں نے تمہارے ماموں سے تمہارا رشتہ مانگا لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔

"جانتی ہو انہوں نے کیا کہا؟ انہوں نے کہا کہ میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔ ہاں تمہیں داشتہ بنا کر رکھ سکتا ہوں۔"

میں چونک پڑی۔ میں نے شوکت کی طرف دیکھنے کے لیے سر اٹھایا مگر میری آنکھوں کے سامنے گھونگھٹ کی دیوار تھی۔ شوکت نے کہا۔

"حمیدہ! گھونگھٹ اٹھا لو' بہتر ہے۔ میرے دل میں خدا کا خوف ہے۔ جب تک مذہبی اور قانونی طور پر ہمارا نکاح نہیں ہو گا میں تمہیں ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔"

میں نے گھبرا کر اپنا گھونگھٹ اٹھا لیا۔ میں دلہن نہیں تھی بلکہ دلہن کے لباس میں تھی۔ میرا کوئی خاوند نہیں تھا مگر بند کمرے میں ایک مرد تنہائی میں چلا آیا تھا۔ میں سہم کر پلنگ کے دوسرے کنارے پر چلی گئی۔ پھر میں نے حیرت سے پوچھا۔

"کیا ہمارا نکاح نہیں ہوا ہے؟"

"نہیں!" اس نے جواب دیا۔ "تمہاری ممانی اور ماموں تمہیں آمدنی کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔ مجھ سے پہلے وہ یوسف نامی ایک بدمعاش سے تمہارا سودا کرنے والے تھے۔ انہوں نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں تین ہزار روپے ماہوار پر تمہیں داشتہ بنا کر رکھ لوں۔ پھر جب میرا جی چاہے تمہیں چھوڑ دوں۔ میرے بعد وہ کسی دوسرے سے سودا کر لیں گے۔

"میں سوچ میں پڑ گیا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ خدا گواہ ہے کہ میں تم سے سچی محبت کرتا ہوں۔ تمہیں داشتہ نہیں بلکہ اپنی شریکِ حیات بنانا چاہتا ہوں لیکن مجبوری یہ تھی کہ اگر میں تمہارے ماموں کی بات سے انکار کرتا تو وہ یوسف سے سودا کر لیتے۔ تم پر اتنا سخت

پہرہ ہے کہ میں تم سے تنہائی میں مل کر یہ ساری باتیں بتا نہیں سکتا تھا۔

"پھر میں نے فیصلہ کیا کہ میں ان کی بات مان لوں تاکہ اس طرح تم سے تنہائی میں ملنا نصیب ہو جائے۔ اس وقت میں ان کی نظروں میں تمہارا خریدار بن کر تمہارے پاس آیا ہوں لیکن تم میری نیک نیتی کا اندازہ کر چکی ہو۔ میں محبت کر سکتا ہوں' گناہ نہیں کر سکتا۔"

میں ایک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔ اپنی بے بسی اور ذلت کے احساس سے مجھے رونا آ رہا تھا۔ میں دونوں ہاتھوں سے چہرے کو چھپا کر رونے لگی۔

"حمیدہ!" اس نے مجھے سمجھایا۔ "یہ رونے کا وقت نہیں ہے۔ اپنے حالات پر غور کرو کہ کس طرح تمہاری عزت خطرے میں ہے اور کس طرح تم اپنی شرافت کو برقرار رکھ سکتی ہو؟"

میں نے روتے ہوئے کہا۔

"میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

اس نے بڑے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"اگر تم مجھ پر اعتماد کرو تو میں تمہیں اس گندے ماحول سے نکال کر لے جاؤں گا۔"

مجھے پہلے سے ہی اس پر اعتماد تھا اور اب اس کی باتیں سن کر میرے دل میں اس کے لیے عقیدت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ چاہتا تو مجھے دھوکے میں رکھ کر اور مجھے داشتہ بنا کر میری زندگی برباد کر سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے اپنے عمل سے ظاہر کر دیا کہ وہ مجھ سے سچی محبت کرتا ہے۔

میں بے اختیار پلنگ سے اتر کر اس کے قریب آئی اور اس کے قدموں سے لپٹ گئی۔

"خدا کے لیے میری عزت بچائیے۔ یہاں سے کہیں دور لے جائیے۔ میں ایک کنیز بن کر آپ کی خدمت کرتی رہوں گی۔"

اس نے مجھے قدموں سے اٹھا لیا اور میرے آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگا۔

"تم میری کنیز نہیں ہو۔ میری محبت ہو' میری عزت ہو۔"

"میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔ آپ نے مجھے ایک بہت بڑے دھوکے سے بچا لیا ہے۔"

"یہ احسان نہیں ہے حمیدہ۔"

میں نے سر جھکا کر کہا۔

"حمیدہ نہیں' حامی کہیئے۔"

"حامی! آج تمہاری محبت پا کر میں کتنی خوشی محسوس کر رہا ہوں' یہ بیان نہیں کر سکتا۔ میں یہاں سے تمہیں ضرور لے جاؤں گا مگر ایک دو روز تک تمہیں یہیں رہنا ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ اس سلسلہ میں جھگڑا بڑھ جائے اور کیس عدالت تک پہنچ جائے۔ تم وعدہ کرو کہ عدالت میں میرا ساتھ دو گی۔"

میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔

"صرف عدالت میں ہی نہیں' زندگی کے ہر قدم پر آپ کا ساتھ دوں گی۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں۔"

شوکت نے میرے بازوؤں کو تھام کر کہا۔

"تم میری زندگی کی پہلی محبت ہو اور میں اپنی زندگی میں محبت کا پہلا وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں حاصل کرنے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دوں گا۔"

"آپ بھی میری زندگی میں پہلے شخص ہیں کہ فرشتہ بن کر میرے سامنے آئے ہیں۔ میں نے آج تک کسی سے اس قسم کا وعدہ نہیں کیا۔ آج پہلا وعدہ کرتی ہوں کہ ایک شریف زادی کی طرح ہمیشہ آپ سے وفا کروں گی اور ہمیشہ آپ کی عظمت کا اعتراف کرتی رہوں گی۔"

یہ کہتے ہوئے میں نے فرط محبت سے اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دیا۔

☆===========☆===========☆

دوسری صبح شوکت میرے کمرے سے چلے گئے۔

ماموں اور ممانی خوش نظر آ رہے تھے کہ ان کا ناپاک منصوبہ کامیاب ہو گیا ہے اور وہ میری زندگی برباد کر چکے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ایک کمرے میں رات گزارنے کے بعد ہم پاک باز نہیں رہے ہیں لیکن کوئی یقین کرے یا نہ کرے' خدا ہماری پاکیزگی کو جانتا ہے۔ ویسے ہم یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ وہ اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب ہو چکے ہیں۔

شوکت نے یہی کہا تھا کہ انہیں خوش فہمی میں مبتلا رکھنا چاہیے تاکہ وہ لوگ زیادہ سے زیادہ ہمیں آزادی سے ملنے کا موقع دیں۔ پروگرام کے مطابق میں کسی دن شوکت کے ساتھ شاپنگ کے لیے جاتی اور پھر کبھی لوٹ کر واپس نہ آتی۔

ہم اپنی سوچی ہوئی تدبیر سے خوش اور مطمئن تھے اور ممانی اور ماموں جان اپنی کامیابی پر مسکرا رہے تھے لیکن کچھ دیر بعد ممانی کے چہرے سے رونق اڑ گئی اور وہ سنجیدہ سی نظر آنے لگیں۔ میں ان کے بدلے ہوئے تیور کو نہ سمجھ سکی۔ یہ تو مجھے بعد میں پتہ چلا کہ وہ کیسی مکار اور حرافہ ہیں۔

شوکت کے جانے کے بعد انہوں نے میرے کمرے میں آ کر سب سے پہلے مجھے دیکھا۔ میں جوں کی توں کنواری دلہن نظر آ رہی تھی۔ نہ تو میری آنکھوں میں سہاگ کی رات کا خمار تھا نہ میری زلفیں بکھری تھیں۔ نہ کاجل پھیلا تھا اور نہ ہی کپڑے شکن آلود تھے۔ ممانی جیسی تجربہ کار عورت کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ انہوں نے کسی سازش کے خطرے کو محسوس کر لیا۔

وہ بظاہر خاموش رہیں۔ شام کو شوکت آئے تو انہوں نے مسکرا کر ان کا استقبال کیا۔ خوب ہنس ہنس کر ان سے باتیں کیں اور انہیں میرے کمرے میں جانے کی اجازت دے دی۔

تھوڑی دیر بعد ممانی دودھ سے بھرا گلاس لے کر کمرے میں آئیں اور بڑے ہی شکایت بھرے انداز میں شوکت سے کہنے لگیں۔

"کل رات تم نے دودھ کیوں نہیں پیا تھا؟"

"بس یونہی۔" شوکت نے کہا۔ "مجھے دودھ پینے کی عادت نہیں ہے۔"

"عادت ہو یا نہ ہو۔ سہاگ رات کو دودھ نہ پینے کا مطلب یہ ہے کہ دولہا دلہن میں محبت نہیں ہے۔"

"محبت کیوں نہیں ہے؟" شوکت نے جواب دیا۔ "ہم ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہتے ہیں۔"

ممانی نے مجھ سے پوچھا۔

"کیوں حامی! یہ سچ ہے؟"

میں نے سر جھکا کر جواب دیا۔

"جی ہاں۔"

ممانی نے طشتری پر رکھے ہوئے دودھ کے گلاس کو میری طرف بڑھا کر کہا۔

"تو پھر لو۔ یہ دودھ اپنے ہاتھوں سے شوکت کو پلاؤ۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ تم دونوں میں کتنی محبت ہے۔"

میں ہچکچانے لگی۔ بھلا یہ بھی کوئی بات تھی؟ میں ممانی کے سامنے دودھ کا گلاس ان کو کیسے پلاتی؟ آخر شرم و حیا بھی تو کوئی چیز ہے۔

ممانی نے کہا۔

"شادی بیاہ میں بہت سی رسمیں ہوتی ہیں۔ ان میں ایک رسم یہ بھی ہے کہ دولہا اور دلہن ایک دوسرے کو اپنے ہاتھوں سے دودھ پلاتے ہیں۔ لہٰذا تمہیں شرمانا نہیں چاہیے۔ میں جھجکتے ہوئے شوکت کو دیکھا۔ وہ بھی پریشان تھے کہ خواہ مخواہ کی رسم ادا کرنے کے لیے کیوں کہا جا رہا ہے۔ ممانی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم دونوں ابھی تک میاں بیوی نہیں بن سکے ہو۔"

میں اس بات پر گھبرا گئی۔ شوکت نے کہا۔

"آپ بھی کیسی باتیں کرتی ہیں۔ ہم بھلا میاں بیوی کیوں نہیں ہیں؟"

"اگر ہو تو پھر دونوں اجنبیوں کی طرح جھجک کیوں رہے ہو؟"

شوکت نے ایک گہری سانس لے کر مجھ سے کہا۔

"حامی! چلو ممانی کی تسلی کر دو۔ جب ہم میاں بیوی ہیں تو پھر جھجک کیسی؟"

میں نے خاموشی سے دودھ کا گلاس اٹھا لیا اور شوکت کے ہونٹوں تک لا کر انہیں پلانے لگی۔

ممانی نے مسکرا کر کہا۔

"یہ بات ہوئی۔ اتنی سی بات کے لیے شرما رہی تھیں۔"

شوکت نے دودھ پی لیا۔ میں نے گلاس ممانی کی طرف بڑھا دیا۔ ممانی نے گلاس کو ہاتھ سے پکڑنے کی بجائے طشتری آگے بڑھا دی۔ اس وقت میں اس کی سازش کو سمجھ نہیں سکی تھی۔ اس لئے میں نے گلاس کو طشتری پر رکھ دیا۔

ممانی نے اسے دور میز کے ایک گوشے میں لے جا کر رکھ دیا۔ پھر انہوں نے کہا۔

"میں تمہارے ماموں کے ساتھ بازار جا رہی ہوں۔ آدھے گھنٹے میں واپس آ جاؤں گی۔ تم گھر کا حیال رکھنا۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے چلی گئیں۔

پندرہ منٹ کے بعد جب وہ ماموں کے ساتھ باہر چلی گئیں تو میں نے باہر کے دروازے کو اندر سے بند کر دیا اور شوکت کے پاس چلی آئی۔

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر پلنگ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے کہا۔

"حامی! میرا دل گھبرا رہا ہے۔"

میں نے ان کی بدلتی ہوئی حالت پر توجہ نہیں دی۔ میں اس وقت یہ سوچ رہی تھی کہ گھر بالکل خالی ہے۔ مجھ پر پہرہ بٹھانے والے آدھے گھنٹے کے لیے جا چکے ہیں۔ لہٰذا یہاں سے فرار ہونے کا بہترین موقع ہے۔

میں ان سے اپنے دل کی بات کہنے لگی۔

"ہمیں اس وقت یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ اس سے اچھا موقع ہاتھ نہیں آئے گا۔"

"ہاں، ہمیں یہاں سے...... جانا...... چاہئے....." انہوں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

پھر بڑی آہستگی سے پلنگ پر لیٹ گئے۔

"آپ تو لیٹ گئے۔" میں نے قریب آ کر کہا۔ "کیا چلیں گے نہیں؟"

اور تب مجھے احساس ہوا کہ وہ بولنے میں تکلیف محسوس کر رہے ہیں۔

وہ بدقت کہہ رہے تھے۔

"دودھ میں کچھ...... ڈاکٹر...... ڈاکٹر کو...... بلاؤ۔"

میں گھبرا گئی۔ ان کا ہاتھ پکڑ کر پوچھنے لگی۔

"کیا ہو گیا ہے آپ کو؟"

وہ کوئی جواب نہ دے سکے۔ ان کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ پھر مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ وہ ڈاکٹر کو بلانے کے لیے کہہ چکے تھے اور میں خواہ مخواہ سوالات کئے جا رہی تھی۔

میں دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر آئی۔ اس کے آگے ایک اور کمرہ تھا اور اس کے آگے صحن تھا۔ میں تیزی سے بھاگتی ہوئی باہری دروازے تک آئی۔ پھر اسے کھول کر باہر نکلنا چاہتی تھی کہ ٹھٹک کر رک گئی۔

دروازے پر یوسف اپنے ایک جواری دوست کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے رُخی سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کیا بات ہے۔ تم کچھ پریشان نظر آ رہی ہو؟"

"وہ...... وہ....." میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "شوکت صاحب کو کچھ ہو گیا ہے۔"

"کچھ ہو گیا ہے؟ کیا ہو گیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"پتہ نہیں!" میں نے جواب دیا۔ "وہ بات نہیں کر سکتے ہیں۔ پلنگ پر آنکھیں بند کئے پڑے ہیں۔ خدا کے لیے کسی ڈاکٹر کو بلا دیجئے۔"

یوسف نے آگے بڑھ کر اندر آتے ہوئے کہا۔

"گھبراؤ نہیں۔ چلو، ہم اسے دیکھتے ہیں۔ اگر طبیعت زیادہ خراب ہوگی تو ڈاکٹر کو بلانے سے بہتر یہ ہے کہ ہم اسے اسپتال پہنچا دیں۔"

یوسف اپنے ساتھی کے ساتھ چلتا ہوا میرے کمرے میں آیا اور شوکت کی نبض دیکھنے لگا۔ پھر اس نے گھبرا کر کہا۔

"یہ تو دم توڑ رہا ہے۔"

"نہیں۔" میں نے چیخ کر حیرت سے کہا۔ "خدا کے لیے انہیں جلدی سے اسپتال لے چلیے۔"

"پاگل ہوئی ہو۔" اس نے سخت لہجے میں کہا۔ "اسے ہسپتال لے جا کر قتل کے مقدمہ میں پھنسنا چاہتی ہو۔"

میں سہم کر اسے دیکھنے لگی۔ یوسف نے ہمدردی جتائی۔

"میں نہیں چاہتا کہ تم جیل جاؤ۔ مجھے سچ سچ بتاؤ۔ کیا تم نے اسے زہر دیا ہے؟"

"نہیں، میں کبھی ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔ میں نے تو اس گلاس سے دودھ پلایا تھا اسی کے بعد ان کی یہ حالت ہوئی۔"

"ہوں!" یوسف کے ساتھی نے کہا۔ "تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے دودھ میں زہر پلایا تھا۔"

"جھوٹ ہے۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "شوکت میرے محسن ہیں۔ میں انہیں زہر نہیں دے سکتی تھی۔ یہ دودھ تو ممانی جان نے مجھے لا کر دیا تھا۔"

"کیا بات ہے؟" ماموں کی آواز آئی۔

میں نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔ ماموں ممانی کے ساتھ دروازے پر کھڑے ہوئے تھے۔ یوسف نے انہیں دیکھ کر کہا۔

"شوکت مر چکا ہے۔"

"نہیں!" میں چیختی ہوئی شوکت کی طرف لپکی لیکن یوسف اور اس کے ساتھی نے مجھے پکڑ لیا۔ یوسف نے میرے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"اس طرح چیخ کر محلے والوں کو یہ نہ جتاؤ کہ یہاں کوئی حادثہ ہو چکا ہے۔"

ممانی گھبرائی ہوئی سی کمرے میں آ کر پوچھنے لگیں۔

"ابھی تو شوکت بالکل ٹھیک تھا۔ یہ مر کیسے گیا؟"

یوسف نے جواب دیا۔

"حامی کہتی ہے کہ تم نے اسے دودھ لا کر دیا تھا اور اس دودھ میں یقیناً زہر ملا ہوا ہے۔"

ممانی نے بگڑ کر کہا۔

"اے لڑکی! کیوں الزام دے رہی ہے۔ دودھ تو تُو نے اپنے ہاتھوں سے پلایا تھا۔"

یوسف نے گلاس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ گلاس پر حامی کی انگلیوں کے نشانات ہیں۔"

"مگر..... مگر...... میں نے زہر نہیں دیا ہے۔" میں خوف سے کانپنے لگی۔

"اس بحث سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔" یوسف نے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ زہر نہ تو آنٹی نے دیا ہے اور نہ ہی تم نے دیا ہے۔ تم دونوں کو بھلا شوکت سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ یہ کسی تیسرے شخص کی سازش ہے۔ مگر حامی! تم بچی نہیں ہو۔ اتنا تو جانتی ہو کہ پولیس پوری طرح تحقیقات کرے گی اور گلاس پر تمہاری انگلیوں کے نشانات دیکھ کر تم پر ہی قتل کا الزام عائد کرے گی۔"

ماموں نے کہا۔

"میرا مشورہ ہے کہ ہم حامی کو بچانے کے لیے گلاس سے اس کی انگلیوں کے نشانات مٹا دیں۔"

"نہیں!" ممانی دوڑتی ہوئی گلاس کے پاس چلی گئی۔ "اگر یہ نشانات مٹ گئے تو حامی مجھ پر قتل کا الزام رکھے گی۔"

میں حیرانی سے انہیں دیکھنے لگی۔ اس وقت میرے دل پر کیا گزر رہی تھی، میں بیان نہیں کر سکتی۔ ایک طرف شوکت کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ وہ میرا محسن تھا لیکن میں اکیلی لڑکی اسے ہسپتال تک نہ پہنچا سکی۔ اگر ان لوگوں میں سے کوئی بھی میرا ساتھ دیتا تو شوکت بچ بھی سکتا تھا لیکن یوسف نے وقت ضائع کر دیا تھا۔ اب ممانی مجھے قاتل ثابت کرنے کے لیے گلاس پر سے میری انگلیوں کے نشانات مٹانا نہیں چاہتی تھیں۔

پھر ہمارے درمیان اس مسئلہ پر بحث ہونے لگی۔ سب نے ممانی کو سمجھایا کہ اس

گلاس کو ضائع کر دیا جائے لیکن وہ راضی نہ ہوئیں۔ آخر وہ کہنے لگیں۔

"حالات ایسے ہیں کہ اگر حامی پر الزام نہ لگا تو مجھ پر لگے گا اور میں ایسی نادان نہیں ہوں کہ تم لوگوں کے کہنے پر یہ گلاس ضائع کر دوں۔ ہاں اگر حامی یہ لکھ کر دے دے کہ شوکت کے مرنے سے پہلے اس نے اپنے ہاتھوں سے اسے دودھ پلایا تھا اور وہ دودھ زہریلا تھا تو میں اس گلاس کو اسی وقت توڑ دوں گی۔"

"میں ایسی غلط باتیں نہیں لکھ سکتی۔" میں نے کہا۔

"میں بھی اپنے سر جھوٹا الزام نہیں لے سکتی۔" ممانی نے جواب دیا۔

ہمارے درمیان پھر بحث ہونے لگی۔

پھر سب کے سب مجھے سمجھانے لگے کہ میں ممانی کی تسلی کے لیے ان کی بات مان لوں۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ تحریر پولیس کو نہیں دکھائی جائے گی۔ وہ تحریر ممانی کو بھی نہیں دی جائے گی بلکہ ماموں اسے اپنے پاس رکھیں گے۔

میرے لیے ان کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اپنی تحریر نہ دیتی تو وہ گلاس ایک ٹھوس ثبوت کی طرح مجھے مجرمہ ظاہر کر دیتا۔

سب نے مل کر مجھے مجبور کر دیا۔

میرے سامنے کاغذ اور قلم رکھا گیا۔ میں نے ان کی ہدایت کے مطابق وہ مختصر سی تحریر لکھ دی۔ پھر اس پر میرے انگوٹھے کا نشان ثبت ہو گیا۔

☆============☆============☆

اسی رات ہم نے وہ مکان چھوڑ دیا اور دوسرے محلے کے ایک مکان میں چلے آئے۔

میں آخری بار شوکت کو نہ دیکھ سکی۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ کسی نے مجھے اس کے قریب جانے کا موقع ہی نہ دیا۔ سب کے سب گھبرائے ہوئے تھے کہ کہیں محلے والوں کو شوکت کی موت کا علم نہ ہو جائے۔ یوسف ماموں اور ممانی کو تسلیاں دے رہا تھا کہ یہ بات آگے نہیں بڑھے گی۔ وہ لاش کو کہیں لے جا کر دفن کر دے گا۔ نہ محلے والوں کو اس کا علم ہو گا اور نہ ہی شوکت کے عزیز و اقارب ہم پر شبہ کر سکیں گے۔ کیوں کہ شوکت یہاں اپنے گھر والوں کی لاعلمی میں آیا کرتا تھا۔ اس کے گم ہو جانے پر پولیس اسے ہر جگہ تلاش کر سکتی تھی لیکن تحقیقات کے لیے ہم تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ شوکت جیسا دولت مند آدمی' ماموں جیسے معمولی آدمی کے ہاں آتا جاتا ہے۔

یوسف کے ساتھی نے راتوں رات ایک نیا مکان تلاش کیا اور ہمیں وہاں لے گیا۔

میں نہیں جانتی کہ شوکت کی لاش کا کیا بنا۔ مگر جب نئے مکان میں مجھے تنہائی نصیب ہوئی اور جب ایک ناکردہ جرم کا خوف آہستہ آہستہ زائل ہونے لگا تو میں بے اختیار شوکت کو یاد کر کے رونے اور تڑپنے لگی۔

وہی تو ایک میرا ہمدرد اور محسن تھا۔

موت کب آتی ہے اور کس بہانے آتی ہے' یہ کوئی نہیں جانتا اور کوئی اس کا راستہ نہیں روک سکتا لیکن رونا مجھے اس بات پر آ رہا تھا کہ اس بیچارے نے میرے ہی

ہاتھوں سے زہر پیا تھا۔

ہائے ممانی نے مجھے کس طرح احمق بنا دیا۔ دودھ کا گلاس اس کے منہ سے لگاتے وقت میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ جو شخص میرے لیے ایک خوشگوار زندگی کا راستہ ہموار کر رہا ہے' میں اسے موت کے راستے پر لے جا رہی ہوں۔

میں جتنا اس بات کو سوچ رہی تھی' اتنا ہی اپنے آپ کو مجرم سمجھتی جا رہی تھی۔

پھر اس جرم کے احساس کی شدت سے مجھے بخار آنے لگا۔ ہر وقت میرے بدن میں حرارت رہنے لگی۔ کبھی اتنے زور کا بخار چڑھ جاتا کہ میں ہذیانی کیفیت میں چیخنے چلانے لگتی۔ کبھی نیند سے چونک کر اٹھ بیٹھتی۔ خواب ہو یا بیداری' ہر وقت میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہتا۔

ایک مہینہ اسی طرح گزر گیا۔ میری حالت کچھ سنبھلنے لگی۔ پھر بھی میں کسی سے ملتی تھی نہ کسی سے بات کرتی تھی۔ ہمیشہ اپنے کمرے میں تنہا اور گم صم سی رہتی تھی۔

ماموں' ممانی اور یوسف میرے اس رویئے پر کچھ پریشان سے تھے۔ پہلے میں نہ سمجھ سکی کہ ان کی پریشانی کی وجہ کیا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ مجھے معلوم ہوا کہ پچھلے دنوں بخار کی حالت میں' میں شوکت کا نام لے کر بڑبڑاتی رہی ہوں اور چیخ چیخ کر یہ کہتی رہی ہوں کہ ممانی نے دودھ میں زہر ملایا تھا اور وہ دودھ میں نے شوکت کو پلایا تھا۔

میری اس جنونی بکواس کو کوئی سن لیتا تو اب تک سب کے سب جیل کی چار دیواری میں پہنچ چکے ہوتے لیکن ممانی اور یوسف حتی الامکان یہ کوششیں کرتے رہتے تھے کہ میری آواز کمرے کی چاردیواری سے باہر نہ جانے پائے۔ پھر میں رفتہ رفتہ صحت یاب ہونے لگی تو وہ میری مسلسل خاموشی سے گھبرا گئے اور مجھ پر کڑی نگرانی رکھنے لگے کہ کہیں میں چپ چاپ وہاں سے نکل کر باہر نہ چلی جاؤں اور کسی کے سامنے اپنے جرم کا اعتراف نہ کر لوں۔

ممانی نے اپنا رویہ بدل دیا تھا۔ وہ مجھ سے محبت سے پیش آنے لگی تھیں اور ہمیشہ مجھے یہ سمجھایا کرتی تھیں کہ جو کچھ ہو چکا ہے' اسے بھول جاؤں۔ ان کے کہنے سے تو میں بھول نہ سکی البتہ وقت بہت بڑا ناصح ہے۔ وہ پھر سے زندہ رہنے کی نصیحت کرتا ہے۔

ممانی اور ماموں مجھے سیر و تفریح کے لئے لے جانے لگے۔ کبھی سینما' کبھی تھیٹر۔ کبھی کسی

نمائش میں اور کبھی میلے میں۔ مجھے اس قدر مصروف رکھنے اور بہلانے لگے کہ آہستہ آہستہ میری سوچ بدلنے لگی۔

میں شوکت کو بھلا تو نہ سکی۔ ہاں' اس بات کا ضرور یقین کر لیا کہ میں مجرمہ نہیں ہوں۔ جو کچھ بھی ہوا میری نادانستگی میں ہوا۔ قدرت کو یہی منظور تھا کہ شوکت ہوا کے ایک جھونکے کی طرح میری زندگی میں آئے اور گزر جائے۔

مجھے شوکت کی شرافت اور عظمت کا اعتراف آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ میں نے اس کے غم کو اپنی ذات کے اندر محدود کر لیا اور اوپر سے دنیا والوں کے لیے مسکرانے لگی۔

مجھے مسکراتے دیکھ کر ممانی نے یوسف کو بھی اپنے تفریحی پروگراموں میں شامل کرنا شروع کر دیا۔ پہلے پہل میں نے اعتراض نہیں کیا۔ وہ ماموں کا دوست تھا میرا اعتراض مناسب بھی نہ ہوتا۔ پھر ایسا ہونے لگا کہ جب ہم سڑکوں پر چلتے تو وہ میرے شانہ بشانہ ہو جاتا۔ ٹیکسی یا سینما ہال وغیرہ میں میرے برابر بیٹھنے کی کوششیں کرتا اور اپنی باتوں سے زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرے قریب آنے کی خاموش تمنا کرتا۔ میں بھی خاموشی سے کترانے لگی۔ میرا خیال تھا کہ وہ سمجھدار ہو گا تو میرے روکھے پن سے سب کچھ سمجھ لے گا۔

ماموں ممانی اور یوسف سب ہی سمجھ گئے کہ میں سیدھی طرح ان کے ہاتھ نہیں آؤں گی۔ انہوں نے بظاہر کچھ نہیں کہا مگر اندر ہی اندر مجھے اپنے دام میں لانے کے لیے منصوبے بنانے لگے۔

ایک رات یوسف اپنے کسی دوست کی کار لے کر آیا اور ہمیں سیر کے لیے اسلام آباد لے گیا۔ کار کی اگلی سیٹ پر یوسف اور ماموں بیٹھے ہوئے تھے اور میں پچھلی سیٹ پر ممانی کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ اسلام آباد سے واپسی پر وہ پشاور روڈ کی طرف نکل گیا۔

ممانی نے بتایا کہ یوسف آج اپنے ہاں کھانے پر لے جا رہا ہے۔

مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ اس ویرانے میں رہتا ہے۔

دو کمروں کے ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے اس نے کار روک دی۔ میرے دل میں ایک انجانا سا خوف پیدا ہو رہا تھا لیکن میں زبان سے کچھ نہ کہہ سکی۔ مکان کے

اندر ہماری میزبانی کے لیے کوئی نہ تھا۔ کھانے پینے کا سامان' شراب کی بوتلیں اور تاش کی گڈیاں سب ہی کچھ موجود تھیں۔ یوسف پہلے ہی تمام چیزوں کا انتظام کر کے یہاں سے گیا تھا اور ہمیں اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔

پھر کھانے کے دوران باتیں ہونے لگیں۔ ماموں نے باتوں کا آغاز کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"حامی! جب تک ہم تمہاری پرورش کر سکتے تھے' کرتے رہے لیکن اب تمہارا بوجھ ہم نہیں اٹھا سکتے۔ لہٰذا میں نے اور تمہاری ممانی نے فیصلہ کیا ہے کہ آج سے تم یوسف کے پاس رہو گی۔"

میرے ہاتھ سے نوالہ چھوٹ گیا۔ میں حیرت سے ماموں کو دیکھنے لگی۔ ممانی نے کہا۔

"ہم جو کچھ بھی کر رہے ہیں' تمہاری بھلائی کے لیے کر رہے ہیں۔ یوسف ایک اچھا لڑکا ہے۔ تم اس کے ساتھ ہمیشہ عیش و آرام سے رہو گی۔"

"مجھے نہیں چاہیے ایسا عیش و آرام۔" میں نے بگڑ کر کہا۔ "کیا میں بکاؤ مال ہوں کہ آپ لوگ اس طرح مجھے یہاں چھوڑ جانا چاہتے ہیں۔"

یوسف نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں' یہی سمجھ لو۔ تمہارا سودا ہو چکا ہے۔ دس ہزار میں' میں نے تمہیں خرید لیا ہے۔"

میرا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ ممانی نے یوسف سے کہا۔

"یہ نہ کہو یوسف کہ سودا ہو چکا ہے۔ کہنے سے پہلے تمہیں رقم ادا کرنی چاہیے۔"

"ہاں بھئی۔" ماموں نے کہا۔ "پہلے رقم گنوا دو۔"

یوسف نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"صبر کیجیے انکل۔ پہلے لڑکی تو راضی ہو جائے۔"

"میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "تم لوگ مجھے جان سے مار سکتے ہو مگر اس سودے پر راضی نہیں کر سکتے۔"

"راضی تو تمہیں ہونا پڑے گا۔" یوسف نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر کہا۔

"اس کاغذ کو تم اچھی طرح پہچانتی ہو۔ اس پر تم نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے کہ شوکت کو تم نے زہر ملا دودھ پلایا ہے۔ یہ تحریر تمہیں پھانسی کے تختے تک لے جائے گی۔"

میں گھبرا کر اس کاغذ کو دیکھنے لگی۔

آہ! اس وقت ایک حقیقت میری سمجھ میں آئی کہ کوئی کسی کو مجبور نہیں کرتا۔ کوئی کسی کو تباہ نہیں کرتا۔ انسان اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی ہی نادانی سے خود کو مجبور بناتا ہے اور اپنے آپ کو تباہ کر لیتا ہے۔ یہ میری نادانی تھی کہ شوکت میرے ہاتھوں سے زہر کا جام پی گیا۔ یہ میری حماقت تھی کہ میں نے خود تباہ کرنے کے لیے اپنے ہاتھ کی تحریر اپنے ہی دشمنوں کو دے دی تھی۔

یہ الگ بات ہے کہ میں اپنی شرافت اور معصومیت سے تباہ ہو رہی تھی لیکن اس دور میں معصومیت کو حماقت سمجھا جاتا ہے۔

میں اس تحریر کو دیکھتی رہ گئی۔ میرے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا اور میں کہتی بھی کیا؟ دو ہی باتیں تھیں۔ یا تو میں اس سودے کو منظور کر لیتی یا پھر انکار کی صورت میں پھانسی کے تختے تک پہنچ جاتی۔

دونوں ہی باتیں میرے لیے قابلِ قبول نہیں تھیں۔

پھر میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ فی الحال مجھے خاموش رہنا چاہیے اور جب تک کوئی ناگوار حادثہ پیش نہیں آتا' مجھے خاموشی سے اپنے بچاؤ کی تدبیر سوچنا چاہیے۔

میری خاموشی کو انہوں نے نیم رضامندی سمجھ لیا۔ یوسف نے مسکرا کر کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ تمہیں اپنی زندگی عزیز ہے۔ اس کاغذ کو دیکھ کر تمہیں راضی ہونا ہی پڑے گا۔"

اس نے کاغذ کو ایک گلاس کے نیچے دبا دیا اور جیب سے سو سو روپے کی ایک گڈی نکال کر ماموں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ پانچ ہزار روپے ہیں۔"

"پانچ ہزار!" ممانی کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"تم نے آج دس ہزار دینے کی بات کی تھی۔" ماموں نے کہا۔

"میں اپنی بات کا پکا ہوں۔" یوسف نے کہا۔ "میں آج پوری رقم دے دیتا مگر

انتظام نہ ہو سکا۔ میرا وعدہ ہے کہ ایک ماہ کے اندر آپ کو باقی روپے بھی دے دوں گا۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔" ممانی نے کہا۔ "پوری رقم لاؤ۔ تب لڑکی ملے گی۔"

ماموں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"دیکھو یوسف! وعدہ خلافی نہ کرو۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم کس طرح ہیرا پھیری سے روپے کماتے ہو۔ تمہاری مستقل آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ پھر میں کیسے یقین کرلوں کہ ایک ماہ کے اندر مجھے باقی رقم مل جائے گی۔"

یوسف نے جواب دیا۔

"آپ بھول رہے ہیں انکل۔ ایک بار میں نے آپ سے کہا تھا کہ میرے والد ایک بہت بڑی مل کے جنرل منیجر ہیں اور دو ہزار روپے ماہوار تنخواہ پاتے ہیں۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ جب چاہوں ان سے پانچ دس ہزار روپے لا سکتا ہوں۔"

"تو پھر لے آؤ۔ بے اعتمادی پیدا کرنے سے کیا فائدہ؟" ماموں نے کہا۔

"لے آؤں گا۔ مگر اس کے لیے مجھے لاہور جانا پڑے گا۔"

میں خاموشی سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ میرے دل میں ایک نامعلوم سا حوصلہ پیدا ہو رہا تھا۔ ان کی بحث و تکرار سے اندازہ ہو رہا تھا کہ شاید ان کے درمیان سودا نہ ہو سکے۔ شاید میں تباہ ہونے سے بچ جاؤں۔ میں سوچ رہی تھی' کبھی ماموں اور ممانی کو دیکھ رہی تھی اور کبھی یوسف کو ٹٹولتی ہوئی نظروں سے سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

پھر مجھے خیال آیا کہ ممانی بھی ایسی ہی ٹٹولتی ہوئی نظروں سے نوجوانوں کو دیکھتی ہیں' انہیں پرکھتی ہیں اور انہیں اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد بیوقوف بناتی ہیں۔ ممانی کے زیرسایہ رہ کر میں نے ان کی عادتوں کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ یہ دوسری بات تھی کہ میں ان کے نقشِ قدم پر نہیں چلتی تھی لیکن اس وقت میرے سوچنے کا انداز ایک دم بدل گیا۔ میں نے سوچا کہ میں یوسف کو بیوقوف بنا سکتی ہوں۔ بس ذرا حوصلے کی ضرورت ہے۔

سوچتے سوچتے یک بیک میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"ٹھہریے!"

وہ تینوں بڑے جوش و خروش سے بحث کر رہے تھے۔ میری آواز سن کر وہ یک

لخت خاموش ہو گئے اور مجھے تکنے لگے۔ میں نے کہا۔

"ماموں جان! شوکت نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ آپ نے اس سے میرا نکاح نہیں کیا تھا۔ وہ سب ایک دھوکہ تھا۔ آج یوسف صاحب سے سودا کر کے آپ نے مجھے یقین دلا دیا کہ آپ محض ایک بیوپاری ہیں۔ میرے ماموں نہیں ہیں۔ ابھی ہو سکتا ہے کہ آپ کے اور یوسف صاحب کے درمیان بات بڑھ جائے۔ سودا ٹوٹ جائے اور آپ مجھے یہاں سے لے جائیں۔

"لیکن میرا بھی فیصلہ سن لیجئے کہ میں یوسف صاحب کو چھوڑ کر یہاں سے نہیں جاؤں گی۔"

وہ تینوں مجھے حیرت سے دیکھنے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ میری بات سن کر یوسف کا چہرہ مسرت سے کھل گیا ہے۔ ممانی نے چیخ کر کہا۔

"کیا بکتی ہے لڑکی! تو بیچ میں نہ بول۔"

"ضرور بولوں گی۔ اگر آپ مجھے یہاں سے لے گئیں تو کسی دوسرے سے سودا کر لیں گی پھر یوسف صاحب میرے لئے کیا برے ہیں۔ کہیں نہ کہیں تو مجھے بکنا ہی ہے۔ پھر میں اس کے ہاتھ کیوں نہ بکوں جس کے ہاتھ میں میری تحریر پہنچ گئی ہے۔"

ماموں نے چونک کر اس ادھ کھلے کاغذ کو دیکھا جو گلاس کے نیچے دبا ہوا تھا۔ انہیں خطرے کا احساس ہو گیا کہ اگر میں نے یوسف کی حمایت کی تو وہ منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔ اس وقت ماموں کے لیے مجھ سے زیادہ وہ تحریر اہم تھی۔ اس تحریر کے ذریعے وہ مجھے اپنے قابو میں رکھ سکتے تھے۔

میں نے یوسف کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"یوسف صاحب! میں آپ کے ساتھ ہوں۔ جب تک آپ نہیں کہیں گے میں یہاں سے نہیں جاؤں گی لیکن میں آپ سے ایک درخواست کرتی ہوں کہ آپ میری صرف ایک بات مان لیں۔"

اس نے خوش ہو کر کہا۔

"میں تمہاری ہر بات ماننے کو تیار ہوں۔"

میں نے سر جھکا کر کہا۔

"میں اتنی سی التجا کرتی ہوں کہ آپ مجھے گناہ پر مجبور نہ کریں۔ کسی وقت بھی چار آدمی بلوا کر نکاح پڑھوا لیں۔ میں بیوی بن کر زندگی بھر آپ کی خدمت کروں گی۔"

میرے یہ الفاظ ماموں اور ممانی کے لیے دھماکہ ثابت ہوئے۔ اچانک ماموں جان نے گلاس پر ایک ہاتھ مارا اور کاغذ کی طرف جھپٹ پڑے۔ یوسف بھی غافل نہیں تھا۔ آدھے کھلے ہوئے کاغذ پر دونوں کے ہاتھ ایک ساتھ آئے۔ ایک ساتھ دونوں نے کاغذ کو اپنی طرف کھینچا اور کاغذ دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہوا دونوں کے ہاتھوں میں آدھا آدھا رہ گیا۔

اسی وقت ممانی نے اٹھ کر یوسف کے ہاتھ پر جھپٹا مارا۔ دونوں میں چھینا جھپٹی ہونے لگی۔ ماموں نے پیچھے سے آ کر یوسف کو پکڑ لیا۔ میں خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھی انہیں کتوں کی طرح لڑتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ آخر بڑی جدوجہد کے بعد ممانی کے ہاتھ کاغذ کی ایک دھجی آئی مگر اسی وقت یوسف نے ان کے بالوں کو مٹھی میں لے کر اتنی زور سے کھینچا کہ ان کی چیخ نکل گئی اور وہ کاغذ کی دھجی ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر کھانے کی میز پر آ گری۔

ماموں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"یوسف! تم ایک لڑکی کی باتوں میں آ کر ہماری پرانی دوستی کو ختم کر رہے ہو۔"

"دوستی میں نے ختم نہیں کی۔ پہل آپ کی طرف سے ہوئی ہے۔ آپ نے مجھ سے کاغذ چھیننے کی کوشش کی ہے۔"

"تو پھر اب صلح کر لو۔ کاغذ ٹکڑے ہو چکا ہے مگر تحریر پھر بھی موجود ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" یوسف نے کہا۔ "مجھے منظور ہے۔"

ماموں نے پیچھے سے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ ممانی بھی دور ہٹ گئیں۔ ماموں نے کہا۔

"آدھا کاغذ تمہارے پاس ہے اور آدھا میرے پاس۔ یہ دونوں ٹکڑے بہت اہم ہیں۔ اب ہماری دوستی اس طرح قائم رہ سکتی ہے کہ یہ آدھا ٹکڑا میرے پاس رہے اور وہ آدھا ٹکڑا تمہارے پاس رہے۔ اگر حامی نے ہمارے سودے سے انکار کیا تو ہم اس کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے ان دونوں ٹکڑوں کو ملا لیا کریں گے۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔

"ماموں جان! مجھے اس سودے سے کوئی انکار نہیں ہے۔ میں پہلے ہی یوسف صاحب سے کہہ چکی ہوں کہ میں ان کی بیوی بن کر رہوں گی اور اب بھی یہی کہتی ہوں حالانکہ وہ دونوں کاغذ کے ٹکڑے آپ لوگوں کے لیے بیکار ہو چکے ہیں۔"

یوسف اور ماموں جان نے میری طرف چونک کر دیکھا۔ پھر اپنے اپنے ہاتھ کے مڑے تڑے کاغذ کو کھول کر پڑھنے لگے۔

یوسف نے کہا۔

"میرے پاس تحریر کا آخری حصہ ہے اور اس میں حامی کے انگوٹھے کا نشان موجود ہے۔"

ماموں نے کہا۔

"میرے پاس تحریر کا پہلا حصہ ہے۔ لاؤ تمہارا کاغذ دکھاؤ۔ میں انہیں ملا کر پڑھتا ہوں۔"

"نہیں۔" یوسف نے کہا۔ "اتنا احمق نہیں ہوں کہ اپنا کاغذ آپ کو دے دوں۔ آپ کے پاس جہاں تک تحریر ہے آپ اسے پڑھیں۔ اس کے بعد میں پڑھتا ہوں۔"

ماموں نے اسے گھور کر دیکھا اور پھر پڑھنے لگے۔

"میں راقم الحروف آنسہ حمیدہ بیگم ولد ملک دین محمد مرحوم اس حقیقت کا اعتراف کرتی ہوں کہ آج مورخہ 5 اگست 1973ء کی رات کو میں نے اپنے کمرے میں......"

پہلی تحریر ختم ہو گئی۔ یوسف نے اس کے بعد پڑھا۔

"......کا یہ احساس ہمیشہ ستاتا رہے گا۔ میں اس وقت پورے ہوش و حواس میں ہوں۔ میں نے اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے یہ اعتراف نامہ لکھا ہے۔"

رقم الحروف

حمیدہ بیگم

یوسف اور ماموں دونوں کو فوراً احساس ہو گیا کہ تحریر ادھوری ہے یعنی بیچ کا وہ حصہ غائب ہے جس میں شوکت کے نام کے ساتھ زہریلا دودھ پلانے کا ذکر تھا۔

"اس کا درمیانی حصہ نہیں ہے۔" ماموں نے غرا کر مجھے دیکھا۔

میں نے جواب دیا۔

"میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اب میری تحریر آپ لوگوں کے کام نہیں آئے گی۔ بیچ کا حصہ میں سالن کے ساتھ چبا کر نگل چکی ہوں۔"

"حرامزادی...... کمینی......" ممانی جان غصہ میں مجھے دونوں ہاتھوں سے مارنے لگیں۔ "تو ہم سے زیادہ چالاک بننا چاہتی ہے۔"

میں انہیں دھکا دے کر یوسف کے قریب چلی آئی اور ماموں سے بولی۔

"میں نے آپ لوگوں سے چالاکی کی ہے' یوسف صاحب سے نہیں۔ میں اب بھی یہی کہتی ہوں کہ آج سے میں ان کے ساتھ رہوں گی۔"

وہ مجھے حیرت اور مسرت سے دیکھنے لگا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"اب آپ بتائیے کہ آپ مجھ پر اعتماد کرتے ہیں یا نہیں؟"

اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔

"میں دل و جان سے تم پر اعتماد کرتا ہوں۔"

ماموں جان مجھے گالیاں دینے لگے۔ ممانی ہاتھ اٹھا اٹھا کر کوسنے لگیں۔ میں نے کہا۔

"خواہ مخواہ گالیاں دینے اور کوسنے سے کچھ نہ ہوگا۔ میں بالغ ہوں اور قانونی طور سے مجھے اس بات کا حق حاصل ہے کہ میں یوسف صاحب کو اپنا شریک حیات بنا سکوں۔ بہتر یہی ہے کہ ہم خاموشی اور اطمینان سے بیٹھ کر صلح پسندی سے کام لیں اور آپس کے جھگڑوں کو ختم کر دیں۔"

صلح پسندی کی بات سن کر وہ نرم پڑ گئے۔ میں نے اپنی جگہ آ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"یوسف صاحب۔ ماموں جان اور ممانی جان نے بہت عرصہ تک میری پرورش کی ہے۔ اس لئے میں ان کا حق مارنا نہیں چاہتی۔ اگر دس ہزار کی بات ہو چکی ہے تو آپ انہیں دس ہزار ہی دیں اور ایک شریف آدمی کی طرح مجھے دلہن بنا کر لے آئیں۔"

ماموں اور ممانی کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔

پھر ممانی یک بیک آگے بڑھ کر میری بلائیں لینے لگیں۔

"اے بیٹی! میں بڑھاپے میں سٹھیا گئی ہوں۔ خواہ مخواہ تجھ پر ہاتھ اٹھا دیا۔ اے بیٹی! برا نہ ماننا۔"

"کوئی بات نہیں ممانی جان! آپ کی بیٹی ہوں۔ آپ ہزار بار مجھے مار سکتی ہیں۔"

"شاباش بیٹا!" ماموں نے خوش ہو کر کہا۔ "آج تم نے ہمارے نمک کا حق ادا کر دیا۔ تم نے یوسف کو پسند کیا ہے تو اب میں واقعی تمہیں دلہن بنا کر اپنے گھر سے رخصت کروں گا۔"

یوسف بھی خوش ہو کر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

پھر وہ تینوں آپس میں لین دین کی باتیں کرنے لگے۔

اب مجھے یہ اچھی طرح احساس ہو گیا تھا کہ وہ تینوں مطلب پرست ہیں۔ پل بھر میں مجھے گالیاں بھی دے سکتے ہیں اور پل بھر میں میرے آگے جھک بھی سکتے ہیں۔ اگر ماموں اور ممانی دیانت دار ہوتے تو اس یوسف سے دس ہزار کا مطالبہ نہ کرتے بلکہ اس رقم کو مہر کے طور پر لکھوا لیتے۔ اس سے میری ازدواجی زندگی کی ضمانت حاصل کرتے۔ مگر وہ دس ہزار کی رقم ہتھیانے پر تلے ہوئے تھے۔

اور یوسف کہاں تک دیانت دار تھا۔ اس کے متعلق میں کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ شرابی اور جواری مرد کو کوئی بھی لڑکی پسند نہیں کرتی۔ میں بھی کبھی اسے دل سے پسند نہیں کر سکتی تھی۔ اس وقت میں جو کچھ بھی کر رہی تھی وہ اس ویرانے سے کسی طرح نکل جانے کی تدبیر تھی۔ میں نے یہی سوچ رکھا تھا کہ یہاں سے نکلنے کے بعد کسی نہ کسی طرح ماموں اور ممانی کو بھی دھوکہ دے کر کہیں بھاگ جاؤں گی۔

وہ تینوں بڑی دیر تک دس ہزار کے مسئلہ پر الجھتے رہے۔ یوسف انہیں یقین دلا رہا تھا کہ اگر کل تک مجھ سے نکاح پڑھا دیا گیا تو وہ پرسوں لاہور جا کر اپنے باپ سے پانچ ہزار کی رقم لے آئے گا۔

آخر ممانی نے یوسف سے کہا۔

"نہ تم ہم پر بھروسہ کرو اور نہ ہم تم پر بھروسہ کرتے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ ہم تمہارے ساتھ لاہور چلیں۔ وہاں میری ایک بیوہ بہن رہتی ہے۔ ہم وہاں رہیں گے۔ تم پوری رقم لے کر آنا اور وہیں سے حامی کو دلہن بنا کر لے جانا۔"

"چلو یہی سہی۔" یوسف راضی ہو گیا۔ "نکاح کے بعد میں حامی کو پھر پنڈی لے آؤں گا۔ میرے والد ذرا دوسرے ٹائپ کے آدمی ہیں۔ وہ اس شادی کو پسند نہیں کریں

گے۔"

"یہ تمہارا اپنا معاملہ ہے۔" ممانی نے کہا۔ "پوری رقم گنوا دو اور لڑکی لے جاؤ۔"

بات طے ہو گئی۔

ہم وہاں سے ہنسی خوشی رخصت ہو گئے۔

اور آج.....

آج ہم اسی پروگرام کے تحت سفر کر رہے ہیں۔ لاہور جا رہے ہیں۔

لاری اڈے کی طرف آتے ہی میں نے اپنا رویہ بدل دیا۔ اب مجھے ان کا ڈر نہیں رہا تھا۔ میں دن کے اجالے میں لوگوں کے درمیان آ گئی تھی۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ موقع پاتے ہی کسی شریف انسان کا سہارا لوں گی اور ان کے چنگل سے نکل جاؤں گی۔

سہارا کسی کا بھی لیا جا سکتا ہے۔ مدد کسی سے بھی مانگی جا سکتی ہے۔ اس لئے آپ کو دیکھ کر میں نے یہ نہیں سوچا کہ آپ ایک معمولی مزدور ہیں۔ ایک قلی ہیں۔ میرے دل نے حوصلہ دیا کہ آپ میری مدد کر سکتے ہیں۔

اور آپ واقعی میری مدد کر رہے ہیں۔

میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔

میرے جسم کا رواں رواں تک آپ کا احسان مند ہے۔

☆------------☆------------☆

حامی اپنی روداد سنا کر خاموش ہو گئی۔

وہ ایک درخت سے ٹیک لگائے اور سر جھکائے کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے پیچھے سیلابی لہریں بے ہنگم آواز کے ساتھ بہتی ہوئی سڑک کے کنارے سے ٹکرا رہی تھیں۔ دور آسمان کی سیاہ بدلیوں سے کبھی کبھی بجلی چمکتی تو اس کے سامنے صفدر کا چہرہ روشن ہو جاتا تھا۔

وہ درخت پر ہاتھ ٹیکے اس کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

حامی کے خاموش ہوتے ہی اس نے کہا۔

"تمہاری داستان ہمارے ملک کی ان ہزاروں لاکھوں یتیم لڑکیوں کی داستان ہے جو والدین کی موت کے بعد اپنے نالائق اور مفاد پرست رشتے داروں کے ہاں پرورش پانے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ تم جس انجام کی طرف جا رہی ہو' اس انجام تک بہت سی مظلوم لڑکیاں پہنچ چکی ہیں لیکن میں تمہیں اس بربادی کی طرف نہیں جانے دوں گا۔"

ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور حامی کے چہرے کو مسرت سے چھوتا ہوا گزر گیا۔

خدا کس قدر مہربان ہے' وہ سوچ رہی تھی' جو لڑکیاں اپنی عزت کی حفاظت آپ کرنے کا حوصلہ رکھتی ہیں اور ہمیشہ اپنی مشکلات سے لڑتی رہتی ہیں۔ خدا ان پر ضرور مہربان ہوتا ہے۔ ان کے لیے کوئی نہ کوئی وسیلہ ایسا بنا دیتا ہے جس کی توقع وہ نہیں کر سکتیں۔

حامی نے تو یہی سوچا تھا کہ راہ چلتے کوئی بھی مل جائے' وہ انسانیت کا واسطہ دے کر

ضرور مدد طلب کرے گی۔ مدد کرنے والا بھی مکار اور خودغرض ہو سکتا تھا' لیکن یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ صفدر میں اب تک ایسا کوئی عیب نظر نہیں آیا تھا۔

صفدر اس کے قریب درخت سے پیٹھ لگا کر کھڑا ہو گیا پھر دونوں ہاتھ اپنے سینے پر باندھ کر بولا۔

"جیسا کہ میں سمجھ چکا ہوں کہ تمہیں اس وقت میرے سہارے کی سخت ضرورت ہے اور جیسا کہ تم اب تک حالات سے سمجھ چکی ہو۔ میں بھی ہر قدم پر تمہارا ساتھ دے سکتا ہوں لیکن اس سے پہلے مجھے اس سہارے کی نوعیت بتا دو کہ تم عارضی سہارا چاہتی ہو یا دائمی۔ عارضی سے میری مراد ہے کہ اس سفر میں تمہارا ساتھ دوں اور تمہیں ان رشتے داروں کے پاس پہنچا دوں جنہوں نے تمہارے والد کے انتقال کے بعد تمہیں پناہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ تم کہو گی تو میں انہیں جا کر سمجھاؤں گا اور انہیں مجبور کروں گا کہ وہ تمہاری مظلومیت کا احساس کریں اور تمہیں اپنے ہاں پناہ دیں۔"

"نہیں!" وہ ہولے سے بولی۔ "میں ان کے ہاں نہیں جاؤں گی۔ وہ جانتے ہیں کہ ممانی کا کردار کتنا گھناؤنا ہے۔ وہ یقین سے کہتے ہیں کہ میں بھی ممانی کی طرح بازاری لڑکی بن چکی ہوں۔ آپ انہیں ہزار یقین دلائیں' پھر بھی وہ مجھے پاکباز اور اچھے کردار کی لڑکی نہیں سمجھیں گے اور اپنی جوان بیٹیوں کے ساتھ رہنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ میں جان بوجھ کر ایسے ماحول میں نہیں جانا چاہتی' جہاں مجھے صرف نفرت ہی نفرت ملے۔"

"اچھی بات ہے!" صفدر نے کہا۔ "اگر تم نے وہاں نہ جانے کا فیصلہ کر لیا ہے تو میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ مجبور اس لئے بھی نہیں کروں گا کہ تمہیں سہارا دینے کے لئے خود میرا دل مجھے مجبور کر رہا ہے۔ جب سے تم نے ایک چھوٹا سا پرزہ لکھ کر مجھ سے مدد طلب کی ہے' اسی وقت سے میرا دل تمہاری طرف کھنچا جا رہا ہے۔ اس خیال سے کتنی مسرت ہوتی ہے کہ کوئی لڑکی اپنا سمجھ کر سہارا مانگ رہی ہے۔ حالانکہ تمہیں سہارا دینے کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ میری جیب میں صرف ایک چونی تھی وہ بھی حجام نے داڑھی بنا کر لے لی۔ میں کتنے حوصلہ اور ذہانت سے تمہارے ساتھ یہ سفر کر رہا ہوں' اسے میں جانتا ہوں یا میرا خدا جانتا ہے۔"

حامی نے دل ہی دل میں کہا۔ "میں جانتی ہوں۔ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ آپ

میری خاطر اپنی ساری زندگی کی محنت کو صرف سات روپے میں نیلام کر رہے تھے تاکہ میرے ساتھ سفر کر سکیں اور میری مدد کر سکیں۔ اللہ! میں کتنی خوش نصیب ہوں کہ ہر بدنصیبی کے بعد پہلے سے زیادہ مضبوط سہارا مل جاتا ہے۔"

صفدر کہہ رہا تھا۔

"بہرحال اس وقت میں تمہارے ساتھ ہوں اور تم چاہو گی تو میں زندگی کی آخری سانس تک تمہارے ساتھ رہوں گا۔ مگر اس دائمی سمجھوتے سے پہلے تمہارا فرض ہے کہ تم مجھے اچھی طرح سمجھ لو۔ ایسا نہ ہو کہ موجودہ حالات سے مجبور ہو کر تم مجھے اپنا لو اور بعد میں تمہیں احساس ہو کہ تم نے غلطی کی ہے۔"

"غلطی..... کیسی غلطی؟" وہ سوچنے لگی۔ "میرے ہمسفر! اب تک میں نے تمہاری ذات میں خوبیاں ہی خوبیاں دیکھی ہیں پھر میں تمہارے کسی عیب کے متعلق کیسے سوچوں؟ اپنے فیصلے میں کسی غلطی کا خوف کیسے محسوس کروں؟"

وہ خاموشی سے سر جھکائے سوچتی رہی۔

صفدر اپنا رخ بدل کر اسے دیکھنے لگا۔ رات کی تاریکی میں اس کے حسن کی چاندنی دھیمی دھیمی سلگ رہی تھی۔ چہرے کے نقوش کہیں کہیں سے جھلک رہے تھے۔ وہ اندھیرے کی چلمن میں چھپی ہوئی بھی تھی اور چھپنے کے باوجود نظر بھی آ رہی تھی۔

وہ اس جلوے کی فریب کاری کو تھوڑی دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر اس نے پوچھا۔

"تم خاموش کیوں ہو گئیں؟ کیا میری بات کا جواب نہیں دو گی؟"

وہ ذرا ہچکچائی پھر ہمت کر کے بولی۔

"مم...... میں فیصلہ کر چکی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ جس طرح دوسروں نے دھوکہ دیا ہے آپ نہیں دیں گے۔"

"تمہیں مجھ پر اتنا اعتماد ہے۔"

"ہاں! انسان اپنی گفتگو سے اور اپنے عمل سے پہچانا جاتا ہے۔ میں عثمان کنڈیکٹر کی باتوں سے سمجھ گئی ہوں کہ آپ کتنے عظیم ہیں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ آپ اپنی ساری زندگی کی محنت کو صرف سات روپے میں نیلام کر رہے تھے۔ میں اسی وقت سمجھ گئی تھی کہ آپ یہ سب کچھ میرے لئے کر رہے تھے۔ کیا اس کے بعد بھی میں آپ پر اعتماد نہ کروں؟"

صفدر مسکرانے لگا۔ اس نے تاریکی میں ڈوبتی اور ابھرتی ہوئی لڑکی کو دیکھ کر کہا۔

"گھبراؤ نہیں۔ میں مجرمانہ ذہنیت نہیں رکھتا حالانکہ وہ مجرم ہیں۔ انہوں نے شوکت کو قتل کیا ہے۔ اس کی سزا انہیں ملنا چاہئے لیکن ان کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اس کے برعکس انہوں نے تمہارے خلاف تحریری ثبوت رکھا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ بھی ضائع ہو گیا۔ وہ بظاہر قانون کی زد میں آنے سے بچ گئے ہیں لیکن قدرت کا قانون ایک دن انہیں ضرور سزا دے گا۔

"فی الحال ہمیں یہ سوچنا چاہئے کہ تم کس طرح ان کے شکنجے سے نکل سکتی ہو؟"

حامی نے جواب دیا۔

"میں ان سے صاف کہہ دوں گی کہ میں ان کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔"

"نہیں' ایسا کہنے سے تمہاری قانونی حیثیت مضبوط نہیں ہوگی۔ اگر تم نے ان لوگوں کے سامنے ان کے ناپاک ارادوں کو ظاہر کر دیا اور کہہ دیا کہ وہ تمہیں دس ہزار میں بیچنا چاہتے ہیں تو پھر تم سب کو کسی تھانہ میں روک لیا جائے گا اور فیصلہ ہونے تک تمہیں کسی فلاحی ادارہ میں بھیج دیا جائے گا۔ ایسے مقدمات کے فیصلے جلد نہیں ہوتے۔ پھر ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اس سلسلہ میں تحقیقات کے دوران شوکت کا قتل بھی سامنے آ جائے۔ یہ سچ ہے کہ تم مجرمہ نہیں ہو لیکن مجرموں کی آلہ کار کہلاؤ گی۔ کوئی تمہاری معصومیت پر یقین نہیں کرے گا۔

"پھر یہ کہ فیصلہ ہونے تک ہم ایک نامعلوم مدت تک ایک دوسرے سے بچھڑ جائیں گے۔ نہیں' میرا مشورہ ہے کہ تم ابھی اپنے ماموں سے علیحدگی اختیار نہ کرو۔"

حامی کچھ مرجھا سی گئی۔ وہ ان لوگوں سے فرار حاصل کرنا چاہتی تھی لیکن صفدر اسے ان ہی کے درمیان قید رکھنا چاہتا تھا۔

"حامی!" اس نے کہا۔ "ان کے ساتھ رہنے میں تمہیں فی الحال اس بات کا ڈر ہے کہ تمہاری عزت خطرے میں پڑ جائے گی۔ مگر تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ لاہور پہنچنے سے پہلے ہی میں یوسف کو تم لوگوں سے دور کر دوں گا۔"

"وہ کیسے؟" وہ تعجب سے اسے دیکھنے لگی۔

صفدر نے بڑے ہی اعتماد سے کہا۔

"عثمان اسے شراب نوشی کے الزام میں پکڑوا دے گا۔ ثبوت کے طور پر اس کے سامان میں شراب کی بوتل بھی موجود ہے۔ یہاں وہ رشوت دے کر رہائی حاصل نہیں کر سکے گا۔ وہ صرف ضمانت پر چھوٹ سکتا ہے۔ مگر لاہور یا پنڈی سے کوئی دوست یا عزیز آ کر ضمانت بھی دے تو اس کے لیے دو تین دن ضائع ہو جائیں گے۔ اس وقت میں تمہارے ماموں اور ممانی کو پندرہ ہزار کا لالچ دے کر انہیں یوسف سے بدظن کر دوں گا۔ وہ تو پہلے ہی یوسف سے جھگڑا کر چکے ہیں۔ پھر وہ سودا کرتے وقت تمہاری پسند کا بھی خیال رکھیں گے تاکہ انہیں منافع حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔"

صفدر کا مشورہ نہایت ہی مناسب تھا۔ حامی نے قائل ہو کر پوچھا۔

"لیکن آپ پندرہ ہزار کہاں سے لائیں گے؟"

"لاہور میں میرا ایک دوست ہے' کمال!" اس نے جواب دیا۔ "وہ ایسا جان نثار دوست ہے کہ میری ایک آہ پر پنڈی تک دوڑا چلا آتا ہے۔ اسے جب میری محبت کا علم ہوگا تو وہ تمہیں اپنی بھابی بنانے کے لیے اپنی تجوری کا منہ کھول دے گا۔"

حامی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔ آپ نے جو تدبیر سوچی ہے اس کی کامیابی کا انحصار آپ کے دوست کی امداد پر ہے۔"

صفدر نے مسکرا کر کہا۔

"تم ٹھنڈی سانس لے کر یہ بات کہہ رہی ہو۔ کیا تمہیں یقین نہیں ہے کہ میرا دوست میری مدد کرے گا۔"

"اگر وہ اتنے دولت مند ہیں کہ تجوری کا منہ کھول دیتے ہیں تو میں نے کبھی کسی دولت مند پر بھروسہ نہیں کیا۔ یہ لوگ پہلے احسان کرتے ہیں پھر احسان جتا کر ہم سے کوئی ایسی عزیز ترین چیز چھین کر لے جاتے ہیں کہ ہم اف بھی نہیں کر سکتے۔"

صفدر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ تمہارا تجربہ ہو سکتا ہے لیکن میرا تجربہ یہی ہے کہ کمال جیسے دوست دنیا میں بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ تم اطمینان رکھو حامی! میں تمہیں ضرور اپناؤں گا اور جب تک تمہیں نہیں اپناؤں گا' اس وقت تک کوئی ظالم تمہاری عزت کی طرف ہاتھ نہیں بڑھا سکے

گا۔ میں شوکت نہیں ہوں کہ غفلت میں مارا جاؤں۔"

حامی اسے محبت اور اعتماد سے دیکھنے لگی۔ تاریکی میں وہ بھی پوری طرح نظر نہیں آ رہا تھا۔ ذرا ذرا سا جھلک رہا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے بہت قریب تھے مگر اندھیرے میں یوں لگ رہا تھا کہ ایک دوسرے کو بہت دور سے دیکھ رہے ہیں۔

صفدر نے اس کی جانب اپنا ہاتھ بڑھا کر کہا۔

"حامی! وقت بہت کم ہے۔ پھر نہ جانے یہ تنہائی کب نصیب ہو۔ آؤ! آج ہم وعدہ کریں کہ آج سے ہم ایک ساتھ جئیں گے' اور ایک ساتھ مریں گے۔ وعدہ کرو!"

وعدہ..... وعدہ!

حامی کانپ سی گئی۔ اسے اپنا پہلا وعدہ یاد آ گیا۔

آہ! وعدے پورے کیوں نہیں ہوتے؟ وعدہ کرنے والے بچھڑ کیوں جاتے ہیں؟

وہ گھبرا کر صفدر کے ہاتھ کو دیکھنے لگی۔ وہ ہاتھ اندھیرے میں ایک سائے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ وہ ہاتھ زندگی کی اس تاریکی میں اس سے بچھڑنے کے لیے نہیں' ملنے کے لیے آیا تھا۔

حامی کے دل نے کہا۔ "میرے پہلے وعدہ میں کوئی کھوٹ نہیں تھا لیکن تقدیر نے اسے توڑ دیا۔ وعدہ کیا ہے؟ ایک سہارے کا یقین ہے۔ اگر ایک سہارا چھوٹ جائے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ دوسرا سہارا حاصل نہ کرے۔"

اس کا نازک سا ہاتھ کانپتا اور لرزتا ہوا آگے بڑھا اور صفدر کے ہاتھ میں آ گیا۔

"میں وعدہ کرتی ہوں' پہلے وعدے کا زخم کھا کر دوسرے وعدے کا یقین دلاتی ہوں کہ جیوں گی تو آپ کے لیے' مروں گی تو آپ کے لیے!"

صفدر نے اس کے ملائم ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام لیا۔

اس کے ہاتھوں کی گرفت حامی کے وعدے کی طرح مضبوط' مستحکم اور سچی تھی۔

☆------------☆------------☆

ٹولنٹن مارکیٹ کے پاس آ کر ٹیکسی رک گئی۔

ماموں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"اب کیا ہو گیا؟"

"پنکچر ہو گیا۔" ڈرائیور نے جواب دیا۔ "اتر جایئے صاحب۔ کوئی دوسری ٹیکسی پکڑ لیجئے۔"

"کیا مصیبت ہے۔" ممانی بڑبڑانے لگیں۔ "نہ جانے ہم پر یہ آفتیں کیوں نازل ہو رہی ہیں۔ وہاں تین دن تک وزیر آباد میں پھنسے رہ گئے۔ اللہ اللہ کر کے بس آگے چلی تو راوی پار کرنا مشکل ہو گیا۔ اب لاہور پہنچے ہیں تو آدھے راستے میں یہ گاڑی پنکچر ہو گئی ہے۔ توبہ ہے' کیا ساری مصیبتیں ہم پر ہی نازل ہونے کو رہ گئی ہیں؟"

بڑبڑانے کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتی تھیں۔ مجبوراً ٹیکسی سے اترنا پڑا۔ ان کے پیچھے حامی بھی اتر کر فٹ پاتھ پر آ گئی۔ ان کے چاروں طرف بڑی رونق تھی۔ سجی ہوئی دکانوں' ہنستے ہوئے چہروں' بھاگتی ہوئی کاروں اور ریشمی لباسوں میں مسکراتی ہوئی عورتوں کو دیکھ کر یہ یقین نہیں ہوتا تھا کہ لاہور کے اطراف سارا ملک سیلاب میں ڈوبا ہوا ہے۔

ماموں ڈگی سے سامان اٹھا کر ان کے قریب آ گئے اور دوسری ٹیکسی کا انتظار کرنے لگے۔ ٹیکسیاں تو بہت سی گزر رہی تھیں مگر خالی نہیں تھیں اور جو خالی تھیں۔ وہ بھی رکے بغیر گزر جاتی تھیں۔

"لعنت ہے ان پر!" ماموں نے غصہ سے کہا۔ "یہ ٹیکسی والے سمجھتے ہیں کہ

سیلاب سے تباہ ہو کر آئے ہیں۔ اس لئے انہیں کرایہ نہیں دے سکیں گے۔"

وہ ایک بیڈنگ پر بیٹھ گئے۔ ممانی بھی ان کے قریب ایک سوٹ کیس پر بیٹھ گئیں۔
حامی کو اس طرح فٹ پاتھ پر بیٹھتے ہوئے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس لئے وہ سمٹی سمٹائی سی ان کے پاس کھڑی رہی۔ ماموں نے کہا۔

"ابھی یوسف ہوتا تو کہیں نہ کہیں سے ٹیکسی پکڑ لاتا۔"

"اب اسے کیوں یاد کر رہے ہو۔" ممانی نے کہا۔ "اچھا ہی ہوا کہ پکڑا گیا۔ اگر وہ بوتل ہمارے سامان سے نکلتی تو فوج کے آدمی تمہیں بھی پکڑ کر لے جاتے۔ چلو' خس کم جہاں پاک۔ ہمارے لئے ایک راستہ بند ہوتا ہے تو دوسرا کھل جاتا ہے۔ وہ تو دس ہزار دے رہا تھا۔ صفدر پندرہ ہزار کا وعدہ کر گیا ہے۔"

"وعدہ ہی وعدہ ہے۔ پندرہ ہزار ہاتھ میں آ جائیں تو یقین کرنا۔" ماموں نے کہا۔

ممانی نے تنک کر کہا۔

"اے تو یوسف نے بھی کون سا دے دیا تھا۔ اس نے بھی تو وعدہ ہی کیا تھا کہ لاہور پہنچ کر دے گا۔"

"میں کچھ نہیں جانتا۔" ماموں نے کہا۔ "جو پہلے رقم لے آئے گا' وہی لڑکی لے جائے گا۔"

حامی نے غصہ سے دیکھتے ہوئے ہولے سے کہا۔

"ماموں جان! فٹ پاتھ پر بیٹھ کر ایسی باتیں کرتے ہوئے آپ کو شرم آنی چاہئے۔"

ماموں ذرا سے گڑبڑا گئے۔ پھر انہوں نے اپنی بیگم سے کہا۔

"دیکھ رہی ہو اس لڑکی کو۔ کیسے تیور بدل کر بولنے لگی ہے۔ پہلے تو منہ سے آواز نہیں نکلتی تھی۔"

ممانی نے انہیں سمجھایا۔

"اب کیا بیچ بازار میں لڑکی سے جھگڑا کرنا ہے۔ تم ہی چپ ہو جاؤ۔"

ماموں غصہ سے منہ پھیر کر بیٹھ گئے۔

حامی اسی طرح کھڑی ہوئی تھی۔ آس پاس سے گزرنے والے اسے گہری دلچسپی

سے دیکھتے جا رہے تھے۔ غریب ہو یا امیر' سب کی نگاہیں اس پر آ کر جم جاتی تھیں۔ ممانی بھی یہی دیکھ رہی تھیں۔ ایک سفید چمچماتی ہوئی کار میں سے ایک نوجوان اترا تھا اور حامی کو دیکھتے ہی یوں ٹھٹک گیا تھا جیسے زندگی میں پہلی بار کسی خوبصورت لڑکی کو دیکھ رہا ہو۔ حامی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ وہ نگاہیں نیچی کئے کھڑی ہوئی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ ایک دولت مند نوجوان اسے دیکھتے ہی پگھل گیا ہے۔

وہ نوجوان سامنے ایک بک سٹال پر چلا گیا اور ایک رسالہ اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ ممانی جیسی جہاندیدہ عورت اس کی حرکتوں کو سمجھ رہی تھی۔

وہ رسالہ سامنے رکھے رسالہ کی اوٹ سے رہ رہ کر حامی کو دیکھے جا رہا تھا۔

ممانی نے اپنے خاوند سے کہا۔

"یوں بیٹھنے سے کام نہیں چلے گا۔ کسی کار والے سے منت سماجت کرو تو وہ ہمیں گھر تک پہنچا دے گا۔"

"اونہہ!" ماموں نے کہا۔ "کار والے ایسے ہی مہربان ہوتے تو آج غریب پیدل چلتے ہوئے نظر نہ آتے۔"

وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور ایک گزرتی ہوئی ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ کرنے لگے۔

ٹیکسی رکی نہیں' آگے بڑھتی چلی گئی۔ ممانی نے کہا۔

"تم تو اپنی ہی حجت کرو گے۔ ذرا عقل سے کام لو۔ اپنے آپ کو سیلاب زدہ ظاہر کرو پھر دیکھو کسی نہ کسی کو ترس آ ہی جائے گا۔ وہ ضرور ہمیں کار میں بٹھا کر لے جائے گا۔"

ماموں نے کہا۔

"بھئی' صاف بات تو یہ ہے کہ مرد کسی مرد کو لفٹ نہیں دیتے۔ تمہارے کہنے سے لفٹ مل جائے تو یہ دوسری بات ہے۔"

ممانی جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ وہ نوجوان بک سٹال سے اپنی کار کی طرف واپس آ رہا تھا۔ وہ بھی تیزی سے چلتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئیں۔

"اے بیٹا! ذرا میری بات سن لو۔"

"فرمائیے!" اس نے بڑی نرمی سے کہا۔

"ہم سیلاب سے تباہ ہو کر آئے ہیں۔ رحمان پورہ جا رہے تھے کہ ٹیکسی خراب ہو گئی۔ اگر ہو سکے تو ہمیں وہاں تک پہنچا دو۔ اللہ تمہارا بھلا کرے گا۔"

نوجوان کی نگاہیں بے اختیار حامی کی طرف اٹھ گئیں۔ حامی بھی اس طرف دیکھ رہی تھی۔ اس طرف دیکھنے کی وجہ ممانی تھیں۔ مگر اس اجنبی سے نظریں ملتے ہی اس نے جلدی سے گردن جھکالی اور اپنے سر کا آنچل درست کرنے لگی۔

نوجوان کو اس کی یہ شرمیلی ادا بہت پسند آئی۔ ممانی نے مسکرا کر کہا۔

"وہ میری بیٹی ہے اور وہ جو پیچھے کھڑے ہوئے ہیں' میرے خاوند ہیں۔ ہم بڑی مصیبتیں اٹھا کر یہاں تک پہنچے ہیں۔ کوئی ٹیکسی یہاں رکنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ ورنہ میں تمہیں تکلیف نہ دیتی۔"

"تکلیف کی کیا بات ہے۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "آیئے بیٹھ جایئے۔ آپ جہاں کہیں گی میں پہنچا دوں گا۔"

ممانی خوش ہو کر اسے دعائیں دینے لگیں پھر وہ جلدی سے حامی کے قریب آئیں اور ماموں سے بولیں۔

"چلو' سامان اٹھاؤ۔ میں نہ کہتی تھی کہ کسی نہ کسی کو ترس آ ہی جائے گا۔"

ماموں نے سامان اٹھاتے ہوئے کہا۔

"میں بھی تو یہی کہہ رہا تھا کہ عورتوں کو ضرور لفٹ ملتی ہے۔"

نوجوان نے ڈگی کھول دی۔ حامی اور ممانی پچھلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئیں۔ سامان رکھنے کے بعد ماموں نوجوان کے ساتھ اگلی سیٹ پر آ گئے اور کار چل پڑی۔

نوجوان نے بیک ویو مرر کا رخ ذرا سا بدل دیا اور اسی آئینہ میں حامی کا جلوہ دیکھنے لگا۔

جھکی ہوئی گھنی پلکیں' تنے ہوئے خمدار ابرو' ستواں ناک' پتلے لب محرابی اور گلابی گلابی۔ چہرے پر سفر کی تھکن تھی لیکن پھر بھی جوانی کی تازگی اور اجلا اجلا سا نکھار تھا۔ اس چھوٹے سے آئینے میں صرف اس کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ ویسے بک سٹال پر کھڑے ہو کر اس نے پیکر جمال کا سراپا بھی دیکھا تھا۔ اس کے جسم کی تراش ایسی جاذب نظر تھی' ایسا گدرایا ہوا بدن تھا کہ نگاہیں لرز کر رہ جاتی تھیں۔

اس نے اپر مال روڈ پر کار کو موڑتے ہوئے پوچھا۔

"آپ لوگ کس علاقہ سے آ رہے ہیں؟"

ممانی نے جلدی سے جواب دیا۔

"ڈسکہ۔ سیالکوٹ سے۔"

حامی اس جھوٹ پر انہیں حیرت سے دیکھنے لگی۔ پھر اسے خیال آیا کہ پنڈی میں تو سیلاب نہیں آیا ہے کہ ممانی خود کو پنڈی کی رہنے والی ظاہر کرتیں۔ راستے میں وہ سنتی آئی تھیں کہ اس سیلاب میں سیالکوٹ بری طرح متاثر ہوا ہے۔ اس لئے وہ نوجوان کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے ڈسکہ سے اپنا تعلق ظاہر کر رہی تھیں۔

ماموں نے مزید ہمدردی حاصل کرنے کے لیے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔

"ہم تو بری طرح تباہ ہو گئے ہیں۔ سال بھر کی گندم اور چاول خرید کر رکھا تھا۔ سب کا سب پانی میں بہہ گیا۔ یوں سمجھئے کہ پیسے پیسے کو محتاج ہو گئے ہیں۔"

نوجوان نے افسوس کا اظہار کیا۔

"واقعی بڑی زبردست تباہی آئی ہے۔ آپ جیسے صاحبِ حیثیت لوگ گھر سے بے گھر ہو گئے ہیں۔"

ممانی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"جو مقدر میں لکھا ہوتا ہے اسے برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔ میں تو بہت صبر کرتی ہوں پر اپنی جوان بیٹی کے متعلق سوچ سوچ کر پریشان ہو جاتی ہوں کہ اب اس کا کیا بنے گا؟"

"میں سمجھا نہیں!" اس نے کہا۔ "آپ بیٹی کے لیے کیوں پریشان ہو رہے ہیں۔"

ممانی نے جواب دیا۔

"یہ میری بیٹی ہے۔ ہم نے دس برسوں میں کوئی پچیس تیس ہزار کا جہیز جوڑ کر رکھا تھا۔ بیٹی کو رخصت کرنے کے کیا کیا ارمان تھے مگر اس سیلاب میں جہیز کا ایک تنکا بھی نہ بچا۔ اب ایسی غربت اور تباہی کے وقت کون رشتہ مانگنے آئے گا۔ لوگ تو جہیز کی چمک دمک پر مرتے ہیں۔ اب تم ہی کہو بیٹا! میری ایسی حسین و جمیل لڑکی کے سامنے بھلا جہیز کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے؟"

حامی ناگواری سے انہیں دیکھنے لگی۔ ممانی کتنے گھماؤ پھراؤ سے ایک اجنبی کے سامنے اس کے حسن کو پیش کر رہی تھیں۔

نوجوان آئینے میں اسے دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں اس بات کا اعتراف کر رہا تھا کہ لڑکی لاکھوں میں ایک ہے۔ جہیز کی دولت اس کے سامنے ذرا سی بھی وقعت نہیں رکھتی۔

اس نے کہا۔

"آپ ذرا حوصلے سے کام لیں۔ ہر شخص جہیز کا لالچی نہیں ہوتا۔" وہ آئینہ کی چمکتی ہوئی سطح پر حامی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "بہت سے لوگ قدر دان ہوتے ہیں۔ وہ صرف لڑکی کی خوبیوں کو دیکھتے ہیں۔ لڑکی والوں سے جہیز مانگنے کی بجائے خود اپنی دولت پانی کی طرح اس لئے بہاتے ہیں کہ لڑکی انہیں پسند آ جاتی ہے۔"

ممانی خوش ہو کر بیٹھے بیٹھے آگے کو کھسک آئیں۔

"جیتے رہو بیٹا! تم نے اپنی باتوں سے بڑا حوصلہ دیا ہے۔ تمہاری نظر میں کوئی ایسا قدر دان ہو تو ہمیں ضرور بتاؤ۔ ہماری طرف سے بس اتنی سی شرط ہے کہ لڑکا ہو تو تمہاری ہی طرح کوئی بھلا مانس ہو۔"

حامی نے غصہ سے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ ابھی لاہور کے لاری اڈے پر ممانی صفدر کے سامنے قسمیں کھا کر آئی تھیں کہ اس کے پندرہ ہزار لانے تک وہ حامی کا رشتہ کسی سے نہیں کریں گی اور اب ایک کار میں بیٹھے ہوئے دولت مند کو کتنی ہیراپھیری سے پھانس رہی تھیں۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ اس اجنبی کو ساری حقیقت بتا دے کہ وہ سیلاب زدہ نہیں ہیں اور وہ ایک ایسی بدنصیب لڑکی ہے جس کے جہیز کے متعلق کبھی اس کے ماموں اور ممانی نے نہیں سوچا بلکہ اسے بکاؤ مال سمجھ کر ہمیشہ اس کا سودا کرتے رہنے کی کوششیں کی ہیں۔

لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ ایسا کہنے میں خود اس کی توہین تھی۔ اجنبی تو یہی سمجھتا کہ وہ ایک شریف زادی نہیں ہے' نیلام کا مال ہے۔ ایک اجنبی کے سامنے اپنی حقیقت بیان کرنے سے فائدہ بھی کیا ہے۔ وہ اتفاق سے مل گیا ہے اور پھر انہیں گھر پہنچانے کے بعد بچھڑ جائے گا۔ یہ سوچ کر وہ خاموش ہو گئی۔

اجنبی کہہ رہا تھا۔

"آپ لوگوں کے کام آ کر میں دلی خوشی محسوس کروں گا۔ اب آپ لوگ نہ تو لڑکی کی فکر کریں اور نہ ہی اس بات کے لیے پریشان ہوں کہ آپ پیسے پیسے کے محتاج ہو گئے ہیں۔ انشاء اللہ! آپ جس قدر تباہ ہوئے ہیں۔ اس سے زیادہ خوشحال ہو جائیں گے۔"

ماموں اور ممانی کی باچھیں کھل گئیں۔

حامی طیش میں آ کر اپنے ہونٹ چبانے لگی۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔

"اچھی بات ہے۔ آپ لوگ گھر چلیں' پھر میں اچھی طرح سمجھ لوں گی۔ راستے میں جھگڑا کرنا مناسب نہیں ہے۔"

رحمان پورہ کی ایک گلی میں پہنچ کر کار رک گئی۔

"یہ میری بہن کا مکان ہے۔" ممانی نے کہا۔ "تم ذرا ٹھہرو۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ حامی کے ساتھ کار سے اتر گئیں اور ایک چھوٹے سے مکان میں داخل ہو گئیں۔ ماموں ڈگی سے سامان نکال کر اندر پہنچانے لگے۔

تھوڑی دیر بعد ماموں اور ممانی اجنبی کے پاس آئے۔ ممانی نے کہا۔

"بیٹا! گھر میں آ جاؤ۔ ہمیں بھی خدمت کرنے کا موقع دو۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ خدمت تو مجھے کرنا چاہیے۔ آپ لوگ میرے بزرگ ہیں۔ ویسے میں گھر میں بیٹھنے کی بجائے یہاں تنہائی میں آپ لوگوں سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں' ہاں' ضرور کہو۔" ماموں نے کہا۔ "ہم جانتے ہیں کہ جو کچھ بھی تم کہو گے ہماری بھلائی کے لیے کہو گے۔"

اجنبی نے کہا۔

"سب سے پہلے آپ یہ بتائیں کہ آپ مجھے اپنا بیٹا سمجھتے ہیں یا نہیں؟"

ممانی نے بلائیں لے کر کہا۔

"میں صدقے' میں واری۔ یہ ذرا دیر کی ملاقات میں تو مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے تم میرے سگے بیٹے ہو۔"

اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر مٹھی بھر کرنسی نوٹ نکالتے ہوئے کہا۔

"اسے میری طرف سے قبول کر لیجئے۔"

نوٹوں کو دیکھ کر دونوں کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی۔ ماموں نے اندازہ لگایا کہ وہ سب ہی سو اور پچاس کے نوٹ ہیں اور کسی طرح ہزار سے کم نہیں ہیں۔

ممانی نے اوپری دل سے کہا۔

"نہیں بیٹا! ہمیں شرمندہ نہ کرو۔"

"اس میں شرمندگی کی کیا بات ہے۔ میں تو آپ ہی کا بیٹا ہوں۔"

"تم نے بیٹا بن کر ہمیں مجبور کر دیا ہے۔"

ماموں کے ہاتھ نوٹوں کی طرف بڑھے مگر ان سے پہلے ہی ممانی نے انہیں اچک کر کہا۔

"نہ جانے تمہاری باتوں میں کیا جادو ہے۔ انکار بھی نہیں کیا جاتا۔"

اجنبی نے سر جھکا کر کہا۔

"کل صبح میں اپنی والدہ کو لے کر آؤں گا۔ وہ آپ سے تمام تفصیلی گفتگو کر لیں گی۔"

"اے بیٹا! جم جم آؤ۔ ہم سے جو خدمت ہو گی' وہ کریں گے۔"

"دیکھئے' کھانے پینے کے سلسلے میں زیادہ تکلف نہ کیجئے گا۔" اس نے تاکید کی۔

"اے تکلف کیسا؟ نہ تم ہمارے لئے غیر ہو' نہ تمہاری والدہ کو ہم غیر سمجھیں گے۔ آپس میں گھر والوں کی طرح بیٹھ کر باتیں کر لیں گے۔ ویسے تم کرتے کیا ہو بیٹا؟"

"ابا مرحوم کے زمانے سے کاروبار کر رہا ہوں۔ گوجرانوالہ میں میری ایک آئرن فیکٹری ہے۔ یہاں برانڈ رتھ روڈ پر شو روم ہے۔ گلبرگ میں ہماری رہائش ہے۔ آپ لوگوں کی دعا سے عزت بھی ہے اور شہرت بھی۔ خدا کے فضل و کرم سے اس وقت کروڑوں کی جائیداد کا مالک ہوں۔"

ماموں اور ممانی کی سانسیں رک سی گئیں۔

انہوں نے کبھی دس ہزار روپے بھی یکمشت نہیں دیکھے تھے۔ یہ روپے یوسف سے ملتے ملتے رہ گئے تھے۔ صفدر سے بھی پندرہ ہزار ملنے کی توقع تھی مگر کروڑوں کی جائیداد کے مالک کے سامنے وہ پندرہ ہزار بھی پھیکے پڑ گئے تھے۔

ممانی نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"ماشاء اللہ! تم تو بہت ہی قابل لڑکے ہو۔ اللہ تمہیں دن دونی رات چوگنی ترقی دے۔"

"یہ سب آپ ہی لوگوں کی دعاؤں کا فیض ہے۔" اس نے سعادتمندی سے کہا۔

"اچھا اب اجازت دیجئے۔ کل انشاء اللہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"خدا حافظ!" دونوں نے بڑی محبت سے کہا۔

کار آگے بڑھ گئی اور تیزی سے دور ہوتی چلی گئی۔ وہ دونوں بڑی دیر تک اس کار کو دیکھتے رہے۔ وہ کار نہیں تھی۔ ان کی تقدیر تھی جس میں کروڑوں کی جائیداد بیٹھ کر جا رہی تھی۔ ان کے دروازے پر پھر ایک بار واپس آنے کے لیے۔

☆------------☆------------☆

صفدر ایک شاندار کوٹھی کے ایک شاندار ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا کمال کی والدہ سے باتیں کر رہا تھا اور بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

کمال کی والدہ نے کہا۔

"میری بات مانو اور روٹی کھا لو۔ پتہ نہیں کمال کس وقت آئے گا۔ تم کب تک اس کا انتظار کرو گے؟"

"آنٹی! آپ نے اسے بہت ڈھیل دے رکھی ہے۔ کھانے کا وقت گزر چکا ہے اور صاحب بہادر کا پتہ نہیں ہے۔ آخر یہ دن بھر کہاں مارا مارا پھرتا ہے؟"

"بس آج ہی گھر سے نکلا ہے۔ سیلاب کی وجہ سے گوجرانوالہ بھی نہیں جاتا۔ میں نے منع کر دیا ہے کہ جب تک پانی کم نہ ہو' وہ فیکٹری نہ جائے۔ وہاں منیجر صاحب کام سنبھال لیں گے۔ آج صبح کہہ رہا تھا کہ کسی طرح پلین کا ٹکٹ حاصل کر کے تمہارے پاس پنڈی جائے گا اور تمہیں زبردستی پکڑ کر یہاں لائے گا۔"

صفدر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اُسے تو جب بھی سوچنے سے فرصت ملتی ہے' میرے ہی پیچھے پڑ جاتا ہے۔ ایک کام کیجئے آنٹی! کسی اچھے سے گھرانے کی لڑکی دیکھ کر اس کے پیروں میں زنجیر ڈال دیجئے۔ میں تو یہاں آگیا ہوں۔ اب ایک خوبصورت سی بھابی آجائے گی تو اس گھر کی رونق بڑھ

جائے گی۔"

آنٹی نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"ایک خوبصورت سی بہو لانے کا خواب میں برسوں سے دیکھ رہی ہوں۔ میں نے اچھے اچھے گھرانے کی لڑکیاں پسند کیں لیکن وہ راضی نہ ہوا۔ کوئی اسے پسند ہی نہیں آتی۔ اب تم اسے مجبور کرو تو شاید وہ شادی کے لئے راضی ہو جائے۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ اسے آنے دیجئے۔ میں اس سے صاف صاف کہہ دوں گا کہ اگر اس نے آپ کی بات نہ مانی اور جلد ہی کہیں شادی کے لیے رضامند نہ ہوا تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

انہوں نے خوش ہو کر کہا۔

"ہاں' یہ ترکیب اچھی ہے۔ تم یہاں سے جانے کی دھمکی دو گے تو وہ مجبور ہو جائے گا۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ وہ تمہیں کتنا چاہتا ہے۔ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ اس بار صفدر آگیا تو میں اس کی ٹانگیں توڑ کر بٹھا دوں گا تاکہ وہ پنڈی واپس نہ جا سکے۔"

"بڑا آیا ٹانگیں توڑنے والا۔" صفدر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اب تو میں اسے ضرور مجبور کروں گا۔ دیکھتا ہوں کہ وہ شادی کیسے نہیں کرے گا۔"

اچانک دروازے پر سے آواز آئی۔

"یہ میرے خلاف کیا سازشیں ہو رہی ہیں؟"

کمال کی آواز سنتے ہی صفدر اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ پھر دونوں دوست دوڑتے ہوئے ایک دوسرے کے قریب آئے اور بڑی گرم جوشی سے لپٹ گئے۔ کمال اسے اٹھا کر گول چکر کاٹنے لگا' اس کی والدہ ہنستی ہوئی انہیں دیکھ رہی تھیں۔ گول چکر لگاتے لگاتے وہ صفدر کو لئے لئے قالین پر گر پڑا۔

"یہ کیا حماقت ہے؟" صفدر نے پوچھا۔

"یہ تمہاری سزا ہے۔" اس نے جواب دیا پھر اس نے اپنی والدہ سے کہا۔ "امی! اس گدھے کو بتا دیجئے کہ میں اس سے ملنے کے لیے پنڈی جا رہا تھا۔"

"بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ گدھے سے ملنے گدھا ہی جا سکتا ہے۔" صفدر نے کہا۔

اس کی والدہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اب وہاں سے اٹھو بھی۔ صفدر نے اب تک روٹی نہیں کھائی ہے۔"

"تو کون سا کمال کر دیا۔" کمال نے کہا۔ "میں بھی ابھی تک بھوکا ہوں۔"

"یہ کبھی میرا احسان نہیں مانے گا۔ آنٹی آپ ملازم کو کھانے لگانے کے لیے کہیں۔ آئندہ میں کبھی کھانے پر اس کا انتظار نہیں کروں گا۔"

اس کی والدہ مسکراتی ہوئی وہاں سے چلی گئیں۔

ان کے جاتے ہی کمال نے صفدر کا بازو پکڑ کر کہا۔

"یار! اب تھوڑی دیر کے لیے سنجیدہ ہو جاؤ۔ آج میری زندگی میں بہت بڑا حادثہ پیش آیا ہے۔"

"حادثہ!" صفدر نے گھبرا کر پوچھا۔ "کیسا حادثہ؟"

کمال نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"محبت کا حادثہ!"

صفدر نے اسے گھور کر پوچھا۔

"یہ تم سنجیدگی سے گفتگو کر رہے ہو؟"

"تمہاری جان کی قسم میں سنجیدہ ہوں۔"

"میری جان کیا مفت میں آئی ہے۔ ارے تم اور محبت۔ تمہارے سینے میں جو دل ہے، وہ محبت کے نام سے کبھی نہیں دھڑک سکتا۔"

"پہلے میں بھی یہی سوچتا تھا۔" کمال نے کہا۔ "لیکن آج یہ دل اسے دیکھ کر بے اختیار دھڑکنے لگا ہے۔ وہ بہت خوبصورت ہے صفدر! اتنی خوبصورت کہ ایسا حسن میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔"

"لیکن وہ ہے کون؟"

"ایک لڑکی ہے۔ میں اسے اچھی طرح نہیں جانتا۔ ویسے وہ ٹولنٹن مارکیٹ سے رحمان پورہ تک میری کار میں بیٹھی رہی۔"

صفدر نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"ہائے ظالم! کس محلے کا نام لیا ہے تم نے۔ وہ بھی رحمان پورہ میں رہتی ہے۔"

"وہ کون؟" کمال نے پوچھا۔

"تمہاری ہونے والی بھابی۔" صفدر نے مسکرا کر کہا۔

"سچ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم بھی گھائل ہو چکے ہو۔" کمال نے پوچھا۔

"ہاں! وہ بھی بہت خوبصورت ہے۔ اتنی خوبصورت کہ دیکھو تو نگاہیں جم کر رہ جائیں۔"

"تعجب ہے۔" کمال نے پوچھا۔ "کیا وہ بھی رحمان پورہ میں رہتی ہے؟"

"ہاں! اس نے مجھے وہیں کا پتہ دیا ہے۔"

کمال نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر مسرت سے کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم دونوں کی بارات ایک ہی محلے میں جائے گی۔"

کمال کی والدہ نے دور سے آتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کس کی بارات کا ذکر ہو رہا ہے؟ ارے تم لوگ ابھی تک فرش پر بیٹھے ہوئے ہو۔ چلو اٹھو، روٹی کھا لو۔"

وہ دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ صفدر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آنٹی! منہ میٹھا کیجئے۔ کمال نے آپ کے لیے ایک خوبصورت سی بہو پسند کر لی ہے۔"

انہوں نے حیرت اور خوشی سے بیٹے کو دیکھا اور صفدر سے کہا۔

"تمہارے منہ میں گھی شکر۔ اے بیٹا! تم نے ایسی خوشخبری سنائی ہے کہ میں تمہارا منہ موتیوں سے بھر دوں گی۔"

پھر انہوں نے بیٹے کے قریب آ کر بڑی محبت سے اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔

"بیٹا! میں بیان نہیں کر سکتی کہ مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ تم مجھے بتاؤ کہ وہ لڑکی کون ہے؟ کہاں کی رہنے والی ہے؟ اس کا خاندان کیسا ہے؟"

کمال نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"امی! خاندان کے بارے میں، میں کچھ نہیں جانتا۔ ویسے وہ بہت شریف لوگ ہیں۔ میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ میری امی کل صبح آپ کے ہاں آئیں گی۔ میں نے

ٹھیک کہا ہے نا؟"

"ہاں میرے لعل! مجھے تو صبح کے انتظار میں رات بھر نیند نہیں آئے گی۔ اب مجھے ساری تفصیل بتاؤ کہ تم انہیں کب سے جانتے ہو؟ لڑکی دیکھنے سننے میں کیسی ہے؟ ویسے مجھے یقین ہے کہ تم نے پسند کی ہے تو وہ میری توقع سے بھی زیادہ اچھی ہوگی۔"

"آنٹی!" صفدر نے کہا۔ "آپ ساری باتیں یہیں کریں گی۔ کھانے کی میز پر چلیے۔ بہت زور کی بھوک لگی ہے۔"

"ہائے اللہ! میں تو بھول ہی گئی کہ تم دونوں بھوکے ہو۔"

"خوشی میں انسان سب کچھ بھول جاتا ہے۔"

وہ تینوں ہنستے ہوئے کھانے کی میز پر آ گئے۔ کمال نے کہا۔

"امی! خوشخبری ایک نہیں بلکہ دو ہیں۔ صفدر نے بھی آپ کے لیے ایک بہو پسند کر لی ہے۔"

"کیا واقعی!" انہوں نے حیرت سے کہا۔ "ارے تم دونوں مجھے خوشی سے پاگل بنا دو گے۔ تم نے کہاں دیکھی ہے لڑکی؟"

صفدر نے کچھ شرماتے ہوئے اور کچھ مسکراتے ہوئے کہا۔

"اسی محلے میں جہاں کمال نے دیکھی ہے۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" انہوں نے تعجب سے کہا۔ "تم تو ابھی پنڈی سے آ رہے ہو پھر یہاں لڑکی کیسے دیکھ لی؟"

"دراصل آنٹی! میں جس بس میں آیا ہوں، اسی بس میں وہ اپنے ماموں اور ممانی کے ساتھ سفر کر رہی تھی۔ راستے میں ہماری جان پہچان ہو گئی۔ انہوں نے مجھے یہاں کا پتہ دیا ہے۔"

آنٹی نے پوچھا۔

"تم نے اچھی طرح دیکھ سمجھ لیا ہے کہ وہ کیسے لوگ ہیں؟"

"جی ہاں! وزیر آباد میں ہمیں دو دن کے لیے رکنا پڑا۔ وہاں مجھے لڑکی سے تنہائی میں باتیں کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ بے چاری بہت مظلوم ہے۔ اس نے مجھے اپنی مظلومیت کی ساری داستان سنا دی۔ داستان بڑی طویل ہے۔ مختصر طور سے اتنا ہی کہوں گا

کہ وہ ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ والدین کے مرنے کے بعد ماموں نے اسے پالا۔ اس کی ممانی ایک بہت بدکار عورت ہے۔ ماموں بھی شرابی ہے۔ انہوں نے روپے کے لالچ میں کئی بار اسے بیچنے کی کوششیں کیں لیکن وہ اپنی عزت کی خاطر ان سے لڑتی رہی۔ آخری بار انہوں نے دس ہزار میں ایک بدمعاش سے اس کا سودا کر لیا۔ سودے کی رقم لاہور میں ادا ہونے والی تھی لیکن میں نے اس بدمعاش کو شراب نوشی کے الزام میں پکڑا دیا۔ اب جب تک وہ رہا ہو کر نہیں آتا، لڑکی کی عزت محفوظ ہے۔ میرے ذہن میں اسے بچانے کی ایک ہی تدبیر تھی کہ میں دس ہزار کی بجائے اس کے ماموں اور ممانی کو پندرہ ہزار کا لالچ دے دوں۔ میں نے اگر کوئی غلطی کی ہے تو آپ بتائیں۔ میں صرف اتنا ہی چاہتا ہوں کہ لڑکی ماموں اور ممانی کے ظلم و ستم سے آزاد ہو جائے۔"

کمال کی والدہ نے کہا۔

"اگر تمہارے بیان کے مطابق لڑکی واقعی شریف ہے اور شرافت سے زندگی گزارنا چاہتی ہے تو تم بہت ہی نیکی کا کام کر رہے ہو۔ میں تمہارے ساتھ ان کے ہاں جاؤں گی اور ان کے منہ پر پندرہ ہزار پھینک کر لڑکی کو لے آؤں گی۔"

صفدر نے محبت اور عقیدت سے ان کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"آنٹی! میں جانتا تھا کہ اس کی مظلومیت کی داستان سن کر آپ یہی فیصلہ کریں گی۔ اگر وہ عزت آبرو سے یہاں آ گئی تو میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔"

انہوں نے پیار بھری ناراضگی سے کہا۔

"اے لڑکے! تم نے یہ احسان مندی کہاں سے سیکھ لی۔ کیا تم میرے بیٹے نہیں ہو؟"

"کیوں نہیں آنٹی! میں تو اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ آپ مجھے ماں کی طرح پیار کرتی ہیں۔"

انہوں نے مسکرا کر اپنے بیٹے کی جانب رخ کیا اور پوچھا۔

"ہاں! اب تم بتاؤ کہ لڑکی والوں کو کب سے جانتے ہو؟"

"جی...... وہ......" کمال نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔ "ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے ان سے ملاقات ہوئی تھی۔"

"کیا؟" انہوں نے تعجب سے پوچھا۔ "کیا اتنی سی دیر میں تم نے فیصلہ کر لیا کہ وہ لڑکی میری بہو بننے کے قابل ہے۔"

"جی ہاں۔ ماڈرن لڑکیاں نہ آپ کو پسند ہیں اور نہ مجھے۔ ان کے برعکس وہ ایک شرمیلی لڑکی ہے۔ جب تک میری کار میں بیٹھی رہی' مجھے آنکھ اٹھا کر دیکھا تک نہیں۔"

"وہ تمہاری کار میں کہاں سے آگئی؟" انہوں نے پوچھا۔

"وہ اپنے والدین کے ساتھ لاری اڈے سے آ رہی تھی کہ راستے میں ٹیکسی خراب ہو گئی۔"

"لاری اڈہ؟" صفدر نے چونک کر پوچھا۔ "کیا وہ بھی کہیں باہر سے آئے ہیں؟"

"ہاں! وہ سیالکوٹ کی ایک تحصیل ڈسکہ کے رہنے والے ہیں۔ سیلاب میں ان کا سب کچھ تباہ ہو گیا ہے۔ اناج' نقدی' کپڑے اور زیورات۔ اپنی بیٹی کے جہیز کے لیے جو کچھ بھی انہوں نے جوڑ رکھا تھا سب کا سب پانی میں بہہ گیا۔ اب آپ ہی بتائیے کہ وہ لڑکی بھی تقدیر کی ستائی ہوئی ہے یا نہیں؟"

"ہاں!" انہوں نے جواب دیا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔ ماں باپ برسوں کی محنت سے تنکا تنکا جوڑ کر جہیز جمع کرتے ہیں کہ ان کی لڑکیاں عزت آبرو سے ڈولی میں رخصت ہو جائیں گی مگر اس سیلاب نے ان لڑکیوں کے سروں سے آنچل بھی چھین لیا۔"

کمال نے کہا۔

"امی! یہی سوچ کر مجھے ان سے ہمدردی ہو گئی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ان سے ملیں گی تو آپ بھی ان کی خانماں بربادی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہیں گی۔"

"بیٹا! تمہاری باتیں سن کر ہی مجھے ان سے ہمدردی ہو گئی ہے۔ اگر تمہارے بیان کے مطابق لڑکی باحیا ہے اور مشرقی تہذیب کی پروردہ ہے تو میں اسے ضرور اپنی بہو بناؤں گی۔"

کمال سر جھکا کر مسکرانے لگا۔ صفدر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"دیکھئے آنٹی! یہ لڑکا تو ایسے شرما رہا ہے جیسے ابھی ابھی اس کا نکاح پڑھا دیا جائے گا۔"

کمال کی والدہ نے مسکرا کر کہا۔

"انشاء اللہ! جلد ہی یہ مبارک گھڑی بھی آئے گی۔ اگر لڑکی والے راضی ہو گئے تو میں اسی مہینہ اپنی بہو کو لے آؤں گی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ لمبی تاریخ پڑے اور اس لڑکے کا ارادہ بدل جائے۔ نہیں' میری طرف سے دیر نہیں ہو گی۔"

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

"آپ کہاں جا رہی ہیں؟"

"کل وہاں جانے کے انتظامات کرنے ہیں۔" انہوں نے جواب دیا۔ "خالی ہاتھ جانا مناسب نہیں ہے۔ بازار سے مٹھائیاں منگوانا ہوں گی۔ اگر مجھے لڑکی پسند آگئی اور بات پکی ہو گئی تو اسے زیور پہنا کر چلی آؤں گی۔ بعد میں اس کے لیے جوڑے سلتے رہیں گے۔"

یہ کہہ کر وہ مسکراتی اور خوشی سے جھومتی ہوئی وہاں سے چلی گئیں۔

ان کے جاتے ہی صفدر نے اپنی کہنی سے کمال کو ٹھوکا دے کر پوچھا۔

"یار' سچ بتانا' تمہاری وہ کیسی ہے؟"

کمال نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"ایسی ہے کہ ایسی اور دوسری پیدا نہ ہو سکے گی۔"

صفدر نے ہاتھ جھٹک کر کہا۔

"جا' جا۔ میری والی سے زیادہ خوبصورت نہیں ہو سکتی۔"

"یہ تمہارا خیال ہے۔ اگر تم اسے دیکھ لو تو اپنی والی کا پتہ ٹھکانہ بھول جاؤ۔"

"اچھا' یہ بات ہے۔" صفدر نے کہا۔ "تو پھر ہو جائے شرط۔ اگر میری ہونے والی بیوی زیادہ خوبصورت ہوئی تو پہلے میری شادی ہو گی۔"

"یار ایسی کڑی شرط نہ لگاؤ۔" کمال نے کہا۔ "بات پکی ہوتے ہی مجھ سے صبر نہ ہو گا۔ میں تو جلد از جلد اسے دلہن بنا کر لاؤں گا۔"

"تو پھر ہار مان جاؤ۔"

"یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ میری دلہن کی توہین ہے۔"

"ہونے والی دلہن پر اتنا ناز ہے تو پھر شرط مان لو۔"

کمال نے گہری سانس لے کر کہا۔

"چلو مان لیا۔ مجھے یقین ہے کہ تم سے پہلے میری ہی شادی ہوں۔"

صفدر دور خیالوں میں کھو گیا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے حامی کا حسین چہرہ طلوع
ہو رہا تھا۔ اس نے عالم خیال میں کہا۔
"سانچ کو آنچ کیا ہے۔ کل ہی اس بات کا فیصلہ ہو جائے گا۔"

☆------------☆------------☆
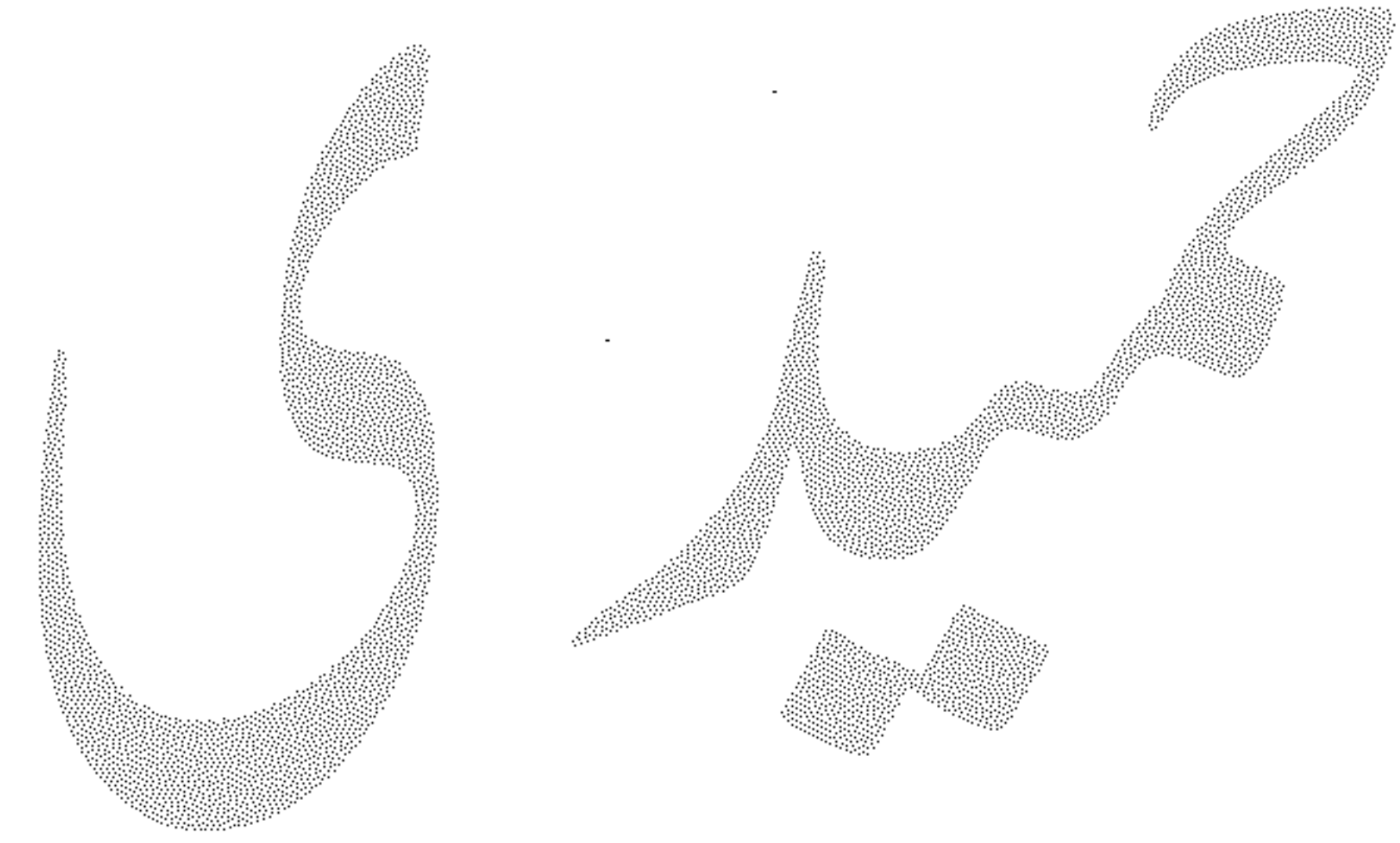
حامی اور ماموں ممانی کے دوران ٹھن گئی تھی۔
پہلے ان کے درمیان زبانی جھگڑے ہوتے رہے پھر حامی کے مسلسل انکار سے ہاتھا
پائی کی نوبت آ گئی۔ ماموں اور ممانی نے مل کر اسے خوب پیٹا۔ لاتوں اور جوتوں سے اس
کی خبر لی مگر وہ یہی کہتی رہی کہ کل صبح اگر کوئی اس کا رشتہ مانگنے آیا تو وہ صاف انکار کر
دے گی۔
ماموں اور ممانی بوڑھے تھے۔ آخر مارتے مارتے تھک گئے۔ ہانپتے کانپتے گالیاں
دینے لگے۔ ممانی کی بڑی بہن نے بھی اسے پیار و محبت سے سمجھایا لیکن وہ اپنی ضد پر
اڑی رہی۔
ممانی کے وینٹی بیگ میں ایک ہزار روپے پڑے ہوئے تھے اور ان کے دل کھلبلی
سی مچی ہوئی تھی کہ کل اس لڑکی نے انکار کر دیا تو کیا ہو گا؟ وہ لڑکا کروڑ پتی ہے۔ نہ جانے
انہیں کتنی رقم ملنے والی تھی۔ دس ہزار سے بھی زیادہ' پندرہ ہزار سے بھی زیادہ۔ شاید
پچیس ہزار' شاید پچاس ہزار۔ بس ذرا ذہانت کی ضرورت تھی۔ وہ لڑکے کی ساس بن کر
زیادہ سے زیادہ دولت ہتھیا سکتی تھیں۔ مگر لڑکی قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ اس کا ایک ذرا
سا انکار اتنی بڑی دولت کو سیلاب کی طرح بہا کر لے جاتا۔
ماموں نے اپنی ران پر ہاتھ مار کر غصہ سے کہا۔
"حرامزادی' اس تحریر کو بھی نگل گئی۔ ورنہ آج میں اسے ننگی کا ناچ نچاتا۔ اب کیا
ہو گا۔ ارے یوسف اور صفدر تو اس لڑکے کے پاؤں کی دھول بھی نہیں ہیں۔ یہ کم بخت

سمجھتی کیوں نہیں کہ یہ رشتہ ہو گیا تو ساری زندگی دولت سے کھیلتے ہوئے گزرے گی۔ اف! میں کیا کروں۔ میرا نشہ ٹوٹ رہا ہے۔"

ممانی نے بگڑ کر کہا۔

"لعنت ہے تمہارے نشہ پر۔ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ شراب کے لیے ایک پیسہ بھی نہیں دوں گی۔"

"ارے واہ' کیسے نہیں دو گی؟ اس ایک ہزار میں میرا بھی حصہ ہے۔"

"اونہہ' حصہ لینے کے لیے پیش پیش رہتے ہو۔ اس وقت میں نے کہا تھا کہ کسی کار والے سے لفٹ مانگو تو تم نے جواب دیا تھا' لفٹ عورتوں کو ملتی ہے' ارے یہ مجھ جیسی عورت ہے کہ تمہیں عیش کرا رہی ہے۔ دوسری ہوتی تو ٹھوکریں مار کر نکال دیتی۔"

ماموں نے تنبیہ کے انداز میں انگلی اٹھا کر کہا۔

"دیکھو جھگڑا نہ کرو۔ یہ میں مانتا ہوں کہ لڑکے کو تم نے ہی پھنسایا ہے مگر لڑکی میری ہے۔ اس لئے حصہ برابر ہونا چاہیے۔ ورنہ اس قصے کو ختم سمجھو۔ میں حامی کو لے کر یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

حامی نے جلدی سے ماموں کے پاس آ کر کہا۔

"ماموں جان! اللہ آپ کو عقل دے۔ آپ تو بے کار ممانی کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔ کل صفدر صاحب کو آنے دیجئے۔ پورے پندرہ ہزار صرف آپ کے حصے میں ہی آئیں گے۔"

"اے خبردار! ہمارے جھگڑے میں نہ پڑنا۔" ممانی نے غرا کر کہا۔ "حرافہ کہیں کی۔ ہمیں آپس میں لڑانا چاہتی ہے۔"

ممانی کی بڑی بہن نے کہا۔

"تم لوگ خود اس بات کا موقع دے رہے ہو۔ ذرا عقل سے کام لو۔ ابھی تو ایک ہزار کے لیے لڑ رہے ہو۔ جب ڈھیر ساری دولت آئے گی تو کیا خون خرابہ کر لو گے؟"

"اللہ کرے کہ یہ آپس میں کٹ مریں' جان تو چھوٹے گی۔" حامی نے نفرت سے کہا۔

ممانی نے ہاتھ نچا کر کہا۔

"اس خوش فہمی میں نہ رہنا بی بی۔ اگر تم سیدھی طرح راضی نہ ہوئیں تو میں تمہیں زہر دے کر مار ڈالوں گی اور تمہاری لاش کو دلہن بنا کر یہاں سے رخصت کروں گی۔"

یہ کہہ کر انہوں نے ایک جھٹکے سے وینٹی بیگ کو کھولا اور اس میں سے دو سو روپے گن کر ماموں کی طرف بڑھا دیئے۔

"لو' پیو اور مرو۔"

مارے خوشی کے ماموں کے دانت نکل گئے۔ انہوں نے لپک کر نوٹوں کو لیا اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"آج انگلش وہسکی چلے گی۔ بہت عرصہ کے بعد موٹی رقم ملی ہے۔ بے چارہ شوکت زندہ تھا تو وہسکی کے پیسے دیا کرتا تھا۔ یوسف تو کنجر نکلا کنجر!"

وہ کمرے سے باہر چلے گئے۔

شوکت کا ذکر سن کر حامی کے دل میں ایک ٹیس اٹھی اور نڈھال سی ہو کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔

یہ تقدیر اسے کہاں گھسیٹ کر لے جا رہی ہے؟ حالات بنتے بنتے بگڑ کیوں جاتے ہیں؟ پہلے شوکت نے اسے سہارا دیا تھا۔ مگر ظالم تقدیر نے اسے چھین لیا۔ اب صفدر کا سہارا ملا ہے تو ماموں اور ممانی پھر اس کی زندگی برباد کرنے پر تل گئے ہیں۔

"نہیں' اب میں ان کے فریب میں نہیں آؤں گی۔"

اس نے چٹان کی طرح ایک مضبوط فیصلہ کیا۔

"میں اگر چاہوں تو صفدر صاحب انہیں پندرہ ہزار بھی نہ دیں لیکن میں جھگڑا بڑھانا نہیں چاہتی۔ انہوں نے میری پرورش کی ہے تو پندرہ ہزار میں یہ احسان اتار ہی دینا چاہیے۔"

"ہاں اگر ماموں اور ممانی صفدر سے کئے ہوئے وعدہ سے پھر گئے اور انہوں نے ایک دولت مند سے رشتہ کرنا چاہا تو وہ اس پندرہ ہزار سے بھی جائیں گے۔"

"میں چاہوں تو ان کے منصوبوں پر پانی پھیر کر ابھی اس گھر سے چلی جاؤں یہ لوگ میرا راستہ نہیں روک سکیں گے لیکن نہیں! مجھے صفدر صاحب کا انتظار ہے۔ میں نے

اس گھر کا انہیں پتہ دیا تھا۔ کل وہ یہاں ضرور آئیں گے اور جب تک وہ یہاں نہیں آئیں گے میں ان لوگوں سے اسی طرح لڑتی رہوں گی۔"

وہ چارپائی پر سر جھکا سوچتی رہی اور دل ہی دل میں فیصلے کرتی رہی۔

آدھے گھنٹے بعد ماموں وھسکی کی بوتل اور گرما گرم کباب لے کر آئے اور اس کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ ممانی نے ایک تپائی سرکا کر ان کے سامنے ایک چھوٹا سا گلاس رکھ دیا اور دوسری کرسی پر بیٹھ کر کباب چکھنے لگیں۔

ماموں نے وھسکی کے پہلے پیگ سے۔ ایک چسکی لی اور ترنگ میں آ کر کہا۔

"آہا' کیا بات ہے ولایتی شراب میں۔ مکھن کی طرح حلق سے اترتی ہے۔"

وہ گھونٹ گھونٹ پینے لگے۔ ممانی نے کہا۔

"زیادہ نہ پی لینا۔ ذرا ہوش میں رہنا۔ آج اس لڑکی سے "ہاں" کرانی ہے۔ نہیں تو کل لڑکے والوں کے سامنے ہماری بے عزتی ہو جائے گی۔"

حامی نے نفرت سے کہا۔

"اونہہ! پہلے کون سی عزت ہے' جو بے عزتی سے ڈر رہی ہو۔"

ممانی نے چڑ کر کہا۔

"میں تم سے زیادہ عزت والی ہوں۔ تم اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہو؟"

"یہ تو کل معلوم ہوگا۔" حامی نے کہا۔ "جب وہ دولتمند اور معزز خاتون یہاں آئیں گی اور جب میں انہیں بتاؤں گی کہ ہم سیلاب زدہ علاقہ سے نہیں آئے ہیں۔ میں آپ لوگوں کی بیٹی نہیں' بلکہ بھانجی ہوں اور آپ لوگ دولت کے لالچ میں زبردستی میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ تب آپ کو پتہ چلے گا کہ آپ کتنی عزت والی ہیں۔ عزت شرافت سے حاصل کی جاتی ممانی جان! دولت سے نہیں۔"

ماموں نے دوسرا پیگ بناتے ہوئے کہا۔

"بھئی لڑائی جھگڑے سے کام نہیں بنے گا۔ میرے دماغ میں ایک فرسٹ کلاس تدبیر آئی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ پینے لگے۔ ممانی نے دلچسپی سے پوچھا۔

"کیسی تدبیر؟"

"ایک دم فرسٹ کلاس۔ اگر ہم اس تدبیر پر عمل کریں تو حامی کا بھی نقصان نہیں ہوگا اور ہمیں بھی دولت مل جائے گی۔"

اتنا کہہ کر وہ پھر پینے لگے۔ ممانی نے چڑ کر کہا۔

"بتا بھی چکو۔ شراب بھاگی تو نہیں جا رہی ہے۔"

انہوں نے دوسرا پیگ خالی کر کے کہا۔

"تدبیر یہ ہے کہ ہم حامی کو صفدر کے ہی حوالے کریں گے لیکن شرط یہ ہے کہ کل وہ دولت مند لڑکا اپنی ماں کو لے کر آئے تو حامی ان کے سامنے کچھ نہ بولے اور کچھ بولنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ نکاح تو نہیں ہو رہا ہے کہ حامی کو قبول کرنا پڑے۔"

"نکاح ہو یا نہ ہو۔" حامی نے کہا۔ "مجھے دوغلی حرکتیں پسند نہیں ہیں۔ میں اس شریف عورت کو دھوکہ نہیں دوں گی۔"

ماموں نے تیسرے پیگ سے گھونٹ لے کر برا سا منہ بنایا۔

"دیکھو حامی! جیسا کہتا ہوں' ویسا کرو۔ تم ابھی نادان ہو۔ آج کل کے چھوکروں کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ فرض کرو کہ صفدر کو پیسے نہیں ملتے اور وہ اپنے وعدہ کے مطابق تمہیں لینے نہیں آتا' تو پھر کیا ہوگا۔"

"وہ ضرور آئیں گے۔" اس نے یقین سے کہا۔

ممانی غصہ سے بولیں۔

"ہم کب کہتے ہیں کہ وہ نہیں آئے گا۔ مگر ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنا ارادہ بدل دے یا اسے کوئی حادثہ پیش آ جائے۔"

"خدا نہ کرے کہ انہیں کوئی حادثہ پیش آئے۔ آپ اپنی کالی زبان بند رکھیں۔"

ممانی کی بہن نے کہا۔

"اے لڑکی! حادثات اور اتفاقات پر کسی کا بس نہیں چلتا۔ تو تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لے کہ وہ اگر نہیں آیا تو تیرا فیصلہ کیا ہوگا۔"

حامی اپنی بات پر اڑی رہی۔

"میں کیوں فرض کروں جبکہ مجھے ان پر پورا اعتماد ہے۔"

ماموں نے گلاس میز پر پٹخ کر نشہ میں جھومتے ہوئے کہا۔

"تمہارے اعتماد کی ایسی کی تیسی۔ اسے باندھ کر مارو۔ اس کی زبان کاٹ دو۔ تاکہ کل یہ اپنی زبان سے کچھ نہ کہہ سکے۔"

حامی غصہ میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"میں آپ لوگوں کی دھمکی میں آنے والی نہیں ہوں۔ اگر آپ نے کوئی زیادتی کی تو میں اس گھر سے چلی جاؤں گی۔"

"کہاں جائے گی؟" ماموں بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر جھومنے لگے۔ "کیا صفدر تجھے مل جائے گا؟"

"وہ نہیں ملیں گے مگر عثمان کنڈیکٹر تو مل جائے گا۔ سیلاب کی وجہ سے سترہ سو ستائیس ابھی واپس نہیں گئی ہوگی۔"

"میں تیری ٹانگیں توڑ دوں گا۔"

حامی نے پاؤں پٹخ کر کہا۔

"اب تو میں ایک پل بھی یہاں نہیں رہوں گی۔"

وہ غصہ میں آگے بڑھی۔ ممانی کی بہن راستے میں آ گئی۔

"اری کم بخت' جائے گی کہاں؟"

حامی نے دونوں ہاتھوں سے اسے دھکا دیا۔ وہ ایک ہی دھکے میں پیچھے چلی گئی۔

ممانی تلملا کر آگے بڑھیں۔

"حرامزادی! میری بہن پر ہاتھ اٹھاتی ہے۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے اسے مارنے لگیں۔ حامی انہیں پرے ہٹاتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ ماموں نے پیچھے سے آ کر اس کی چوٹی پکڑ لی۔

"چھوڑ دو مجھے۔ میں یہاں نہیں رہوں گی۔"

وہ اپنے آپ کو چھڑانے لگی پھر اسی جدوجہد میں اس کا ایک بھرپور ہاتھ ماموں کے منہ پر پڑا۔ وہ نشہ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے اور پیچھے کی طرف لڑکھڑاتے ہوئے تپائی پر آ گرے۔ تپائی پر رکھی ہوئی بوتل ان کی زد میں آ کر لڑھک گئی مگر نیچے گرنے سے پہلے ہی ماموں نے اسے پکڑ لیا۔

وہ غصہ میں چیختے ہوئے پلٹے۔

"میں کہتا ہوں رک جا۔"

حامی اس وقت تک ممانی کو بھی ایک طرف دھکا دے چکی تھی اور غصہ میں تلملاتی ہوئی دروازے کے قریب پہنچ رہی تھی۔

"حامی!" ماموں اس کے پیچھے دوڑے۔

مگر نہ تو وہ رکی اور نہ ہی اس نے پلٹ کر دیکھا۔

پھر ماموں کا ہاتھ چل گیا۔ بوتل فضا میں بلند ہوئی اور حامی کے سر پر آ کر ایک زوردار آواز کے ساتھ ٹوٹ گئی۔

اس کے حلق سے ایک چیخ نکلتے نکلتے گھٹ گئی' ایک کراہ کے ساتھ اس کے دونوں ہاتھ اپنے سر کی طرف گئے' پھر وہ چکرا کر گر پڑی۔

یہ سب کچھ ذرا سی دیر میں ہوا۔ پھر جیسے ماموں کا نشہ ہرن ہو گیا۔ ممانی اور ان کی بہن بھی گھبرا گئیں۔ ان کے سامنے حامی ایک لاش کی طرح فرش پر پڑی ہوئی تھی اور اس کے سر سے رستا ہوا خون اس کی گردن اور کپڑوں کو تر کرتا جا رہا تھا۔

☆------------☆------------☆

تھوڑی دیر تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا سے کیا ہو گیا ہے۔

پھر ممانی نے گھبرا کر کہا۔

"ارے' یہ مر تو نہیں گئی؟"

"آں!" ماموں بوکھلا گئے۔ "نن..... نہیں۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا ہے۔"

ممانی کی بہن نے اپنا سینہ پیٹ کر کہا۔

"ہائے' یہ میرے گھر میں کیا ہو گیا۔ یہ تم لوگوں نے کیا کر دیا۔ تمہارے ساتھ مجھے بھی پھانسی ہو جائے گی۔"

ممانی نے آگے بڑھ کر کہا۔

"تم کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ ذرا آگے بڑھ کر دیکھو۔ زندہ بھی ہے یا مرگئی ہے؟"

ماموں اس کے قریب آ کر جھک گئے اور اسے ہلا ہلا کر آوازیں دینے لگے۔

"حامی! حامی!"

انہوں نے نبض ٹٹول کر دیکھا۔

"ابھی زندہ ہے۔"

"زندہ ہے؟" ممانی بھی قریب آ گئیں۔ "اس کے سر سے خون بہہ رہا ہے' اسے بند کرو۔"

"کیسے بند کروں؟" ماموں گھبرا کر بولے۔ "اسے ہسپتال لے جانا ہو گا۔"

"پاگل نہ بنو۔" ممانی نے ڈانٹ کر کہا۔ "ہسپتال کے ڈاکٹر اس وقت تک مرہم پٹی نہیں کریں گے جب تک کہ تھانے میں رپورٹ نہیں لکھائی جائے گی۔"

"پھر کیا ہو گا؟"

"تمہارا سر ہو گا۔" ممانی غصہ سے بولیں۔ "ارے کسی پرائیویٹ ڈاکٹر کو بلاؤ۔ اس کی جیب گرم کرو۔ تاکہ یہ معاملہ تھانہ کچہری تک نہ پہنچے۔"

ممانی کی بہن نے کہا۔

"میں ایک ڈاکٹر کو جانتی ہوں' ہمارے ہی محلے میں رہتا ہے۔ میں ابھی بلا کر لاتی ہوں۔"

وہ گھبراہٹ میں ہانپتی کانپتی کمرے سے باہر چلی گئی۔

ماموں نے حامی کو دونوں بازوؤں میں اٹھانے کی کوشش کی۔ ممانی نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ پھر انہوں نے کسی طرح اسے چارپائی پر لا کر ڈال دیا۔ ماموں اپنی جیب سے رومال نکال کر سر کی چوٹ پر رکھنے لگے تاکہ کسی طرح خون رک جائے۔ ممانی جھاڑو لے کر جلدی جلدی فرش پر سے بوتل کی کرچیاں سمیٹنے لگیں۔

مارے گھبراہٹ کے دونوں کا برا حال تھا۔ ممانی انہیں صلواتیں سنانے لگیں۔

"اسی لئے کہتی ہوں کہ نشہ نہ کیا کرو۔ ایک تو راستے میں پکڑا گیا۔ اب تمہاری باری آ گئی ہے۔ اگر یہ مرگئی تو سیدھے پھانسی پر لٹکو گے۔"

ماموں نے خوف سے کانپتے ہوئے کہا۔

"اری نیک بخت! کیوں میرے دل میں دہشت بٹھا رہی ہے۔ یہ..... یہ تو ابھی زندہ ہے۔ ڈاکٹر آئے گا تو یہ ہوش میں آ جائے گی۔"

"ہوش میں تو آ جائے گی مگر ڈاکٹر کے پیسے کون بھرے گا۔ یہ معمولی کیس نہیں ہے کہ دس بیس سے کام چل جائے۔ لعنت ہے' ایسی تقدیر پر۔ کیا ہزار روپے اسی لئے تھے کہ آدھے شراب میں جائیں اور آدھے ڈاکٹر کی جیب میں۔"

ماموں اپنا سر تھام کر بیٹھ گئے۔ ساری زندگی ہیرا پھیری کرتے رہے۔ ساری زندگی پیسے کماتے رہے۔ مگر یہ کمائی ہمیشہ اس طرح ضائع ہو جاتی تھی کہ آج تک اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا تھا۔ حرام کے پیسے حرام میں ہی چلے جاتے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر آ گیا۔ اس نے حامی کے سر کے زخم کو دیکھا اور حادثہ کی نوعیت دریافت کرنے لگا۔

ممانی کی بہن نے اشارہ کیا۔ ممانی نے وینٹی بیگ کھول کر سو روپے کا ایک نوٹ نکالا اور ڈاکٹر کی طرف بڑھا کر کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! گھریلو جھگڑوں میں ایسا ہوتا ہی ہے۔ آپ کسی طرح اسے بچا لیں۔"

ڈاکٹر نے نوٹ کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر تیور بدل کر کہا۔

"میں رشوت نہیں لیتا۔ علاج کی فیس لیتا ہوں اور میری فیس تین سو روپے ہے۔"

ممانی کی بہن نے کہا۔

"اے راشد صاحب! آپ کون سے سچ مچ کے ڈاکٹر ہیں۔ ساری زندگی کمپاؤنڈر بنے رہے۔ اب کسی کی جعلی سند حاصل کر کے ڈاکٹر بنے ہیں تو اپنے ہی محلے والوں پر رعب جما رہے ہیں۔"

جعلی ڈاکٹر راشد نے کہا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں ڈاکٹر نہ سہی' ایک عام آدمی کی حیثیت سے بھی اگر تھانہ میں رپورٹ درج کرا دوں تو تمہارا کیا بنے گا؟"

"اسی لئے تو زبان بند کرنے کے لئے سو روپے دیئے جا رہے ہیں۔ چلو سو نہ سہی' دو سو لے لو۔ اس سے زیادہ ہمارے پاس نہیں ہے۔"

ممانی نے دوسرا سو کا نوٹ بھی نکال کر آگے بڑھا دیا۔ راشد نے سمجھ لیا کہ اس سے زیادہ نہیں مل سکے گا۔ لہٰذا اس نے دو سو روپے لے لئے اور حامی کے زخموں کی مرہم پٹی کے لیے مصروف ہو گیا۔

ماموں اور ممانی دوسرے کمرے میں چلے آئے۔ ماموں کو فکر تھی کہ حامی اب دوبارہ ہوش میں آ بھی سکے گی یا نہیں اور ممانی کو غصہ تھا کہ دو سو روپے مفت میں ضائع ہو گئے ہیں۔

دوسرے کمرے سے راشد کی بڑبڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ لڑکی

کو بڑی بے دردی سے مارا گیا ہے۔ خون بہت ضائع ہو چکا ہے۔ بہرحال خون رک جائے گا۔ مرہم پٹی بھی ہو جائے گی اور لڑکی بھی ہوش میں آ جائے گی۔ مگر اسے ہسپتال پہنچانا ہی ہو گا۔ جب تک اس کے جسم میں نیا خون نہیں دیا جائے گا یہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہو گی۔

"کیا مصیبت ہے۔" ماموں نے کہا۔ "ہم سوچتے کچھ ہیں اور ہوتا کچھ ہے' بھئی یہ لڑکی قابو میں نہیں آئے گی۔ ہوش میں آتے ہی پھر ہنگامہ شروع کر دے گی۔ بہتر یہی ہے کہ ہم صفدر سے پندرہ ہزار لے کر اس معاملہ کو ختم کر دیں۔"

ممانی نے بھی شکست تسلیم کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں' اب بہتری اسی میں ہے کہ ہم زیادہ لالچ نہ کریں۔ پندرہ ہزار بہت ہیں۔ جہنم میں جائے یہ لڑکی۔ ہمارے لئے تو کانٹوں کا بستر بن گئی ہے۔"

وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب بیٹھے ہوئے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے اور اس حقیقت کو تسلیم کر رہے تھے کہ حامی ضد کی پکی ہے اور اس کی مرضی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکیں گے لہٰذا اسے صفدر کے حوالے کرنے کے بعد پندرہ ہزار روپے لے کر یہاں سے چلے جانا چاہیے۔

ایک گھنٹہ بعد حامی کی مرہم پٹی ہو گئی۔ اس دوران دو انجکشن لگائے جا چکے تھے۔ راشد نے انہیں یقین دلایا کہ آہستہ آہستہ وہ ہوش میں آ جائے گی۔

وہ سب کے سب حامی کے آس پاس چارپائی اور کرسیوں پر بیٹھ گئے اور دھڑکتے ہوئے دل سے اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگے۔ ماموں جانتے تھے کہ آنکھ کھلتے ہی وہ پھر چیخنا چلانا شروع کر دے گی لہٰذا انہوں نے بہتر یہی سمجھا کہ ہوش میں آتے ہی وہ حامی کے سامنے اپنی شکست تسلیم کر لیں اور اسے یقین دلا دیں کہ صفدر سے ہی اس کا رشتہ ہو گا۔

راشد نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"جب لڑکی ہوش میں آ جائے تو کوئی اس سے باتیں نہ کرے۔ پہلے میں اس کی ذہنی پریشانیوں کو سمجھوں گا پھر فیصلہ کروں گا کہ آپ لوگوں کو فی الحال اس سے باتیں کرنا چاہئے یا نہیں۔"

"راشد صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔" ممانی کی بہن نے کہا۔ "اگرچہ یہ ڈاکٹر نہیں ہیں مگر پھر بھی ڈاکٹروں کا تجربہ رکھتے ہیں۔ بیس برس تک کمپاؤنڈر کا کام کر چکے ہیں۔ ہر قسم کے مریضوں سے ان کا واسطہ پڑتا رہا ہے۔ اسی لئے تو میں انہیں لے کر آئی ہوں کہ گھر کی بات گھر ہی میں دفن رہے گی اور لڑکی بھی اچھی ہو جائے گی۔"

اسی وقت ہلکی سی کراہ سنائی دی۔

تمام لوگ حامی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ راشد اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"آواز بالکل نہ ہو۔ آپ لوگ خاموش رہیں۔ گھر میں دودھ ہو تو ایک گلاس لے آئیں۔"

ممانی کی بہن دودھ لانے چلی گئی۔

حامی ہولے ہولے کسمسا رہی تھی۔ اس کے چہرے سے ایسا کرب ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ شدید درد اور تکلیف محسوس کر رہی ہو۔ پھر اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ رینگتا ہوا سر کی طرف جانے لگا جہاں پٹی بندھی ہوئی تھی۔

راشد اس کے قریب آ گیا۔

وہ دھیرے دھیرے آنکھیں کھولنے لگی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے راشد کا دھندلا سا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ پھر وہ چہرہ آہستہ آہستہ صاف طور سے دکھائی دینے لگا۔ اس کے نازک سے لبوں میں لرزش پیدا ہوئی۔ پھر وہ کراہتے ہوئے بولی۔

"آہ....... میرا سر!"

راشد نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"گھبراؤ نہیں۔ میں دوا دیتا ہوں۔ ابھی تمہیں آرام بھی آ جائے گا اور نیند بھی آ جائے گی۔"

"آپ...... آپ کون ہیں؟"

"میں ڈاکٹر ہوں۔ تم زیادہ باتیں نہ کرو۔ ورنہ تکلیف بڑھ جائے گی۔"

راشد اپنے بیگ سے دو ٹیبلٹ اور ایک کیپسول نکال کر ممانی سے بولا۔

"آپ لڑکی کو ذرا آرام سے اٹھائیں۔ یہ دوا کھلانا ہے۔"

ممانی اس کی گردن کے نیچے ہاتھ رکھ کر اسے اٹھانے لگیں۔ دوسری طرف سے

ڈاکٹر نے سہارا دیا۔ ممانی کی بہن دودھ لے کر آ گئی تھی۔ حامی ٹیبلٹ اور کیپسول نگلنے کے بعد دودھ پینے لگی۔

ماموں خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہے تھے کہ حامی توقع کے خلاف بالکل خاموش اور پُرسکون ہے۔ ممانی کے قریب آنے پر بھی اس نے اعتراض نہیں کیا ہے۔

دودھ پلانے کے بعد اسے پھر لٹا دیا گیا۔ راشد انجکشن تیار کرنے لگا۔

حامی ساکت پڑی ہوئی تھی۔ صرف دیدے گھما کر کمرے کو دیکھ رہی تھی جیسے وہ خود کو کسی اجنبی ماحول میں محسوس کر رہی ہو۔

پھر اس نے بڑی نقاہت سے پوچھا۔

"میں...... میں کہاں ہوں؟"

"تم اپنے گھر میں ہو۔" راشد اس کے بازو میں انجکشن لگانے لگا۔

وہ تکلیف سے کراہ کر بولی۔

"آہ...... میرے سر کو کیا ہو گیا ہے۔"

"چوٹ لگ گئی تھی۔ گھبراؤ نہیں، تم جلد ہی اچھی ہو جاؤ گی۔"

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ ایک لمحہ کے لیے گہری خاموشی چھا گئی۔ پھر ممانی نے بڑی محبت سے اس کے ہاتھ کو سہلا کر کہا۔

"بیٹا! جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ۔"

"بھول جاؤں؟" حامی نے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا اور پوچھا۔ "آ..... آپ کون ہیں؟"

ممانی چونک پڑی۔ ممانی ہی نہیں بلکہ سب ہی چونک پڑے۔ وہ اس کو گھر کو نہیں پہچان رہی تھی۔ ابھی اس نے پوچھا تھا کہ میں کہاں ہوں؟ وہ ممانی کو نہیں پہچان رہی تھی اور پوچھ رہی تھی کہ آپ کون ہیں؟

راشد نے اس کے قریب جھک کر ممانی کی طرف اشارہ کیا۔

"تم انہیں پہچانتی ہو؟"

وہ ممانی کو ایک ٹک دیکھنے لگی اور انہیں پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔

راشد نے ماموں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"تم انہیں پہچانتی ہو؟"

وہ ماموں کو پلکیں جھپک جھپک کر دیکھنے لگی۔ اس کے دیکھنے کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ماموں کو نہیں پہچان رہی ہے۔

چند لمحوں بعد وہ کمزور سی آواز میں بولی۔

"نہیں...... یہ لوگ کون ہیں؟ میں..... میں کون ہوں.....؟ ڈاکٹر صاحب میں یہاں کیسے آگئی؟"

سب حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

راشد نے اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا۔

"تم اپنے ذہن پر زور نہ ڈالو۔ یہ تمہارے بزرگ ہیں۔ تمہیں سب کچھ بتا دیں گے۔ اس وقت تم آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرو۔"

حامی کی آنکھوں سے تشویش ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ اب بھی اپنے اور اس ماحول کے متعلق سوچے جا رہی تھی۔ راشد نے کہا۔

"میں تمہارا ڈاکٹر ہوں' کیا تم میری بات نہیں مانو گی؟ آنکھیں بند کر لو۔ تمام خیالات کو ذہن سے جھٹک دو۔ تم کون ہو؟ کہاں ہو؟ کس حال میں ہو؟ کچھ سوچنے کی کوشش نہ کرو۔ بلکہ سونے کی کوشش کرو۔"

حامی نے اس کی ہدایت کے مطابق آنکھیں بند کر لیں۔

ماموں اور ممانی ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے اور نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ بات بگڑتی جا رہی ہے۔ اب تو اس لڑکی نے ہمیں پہچاننے سے انکار کر دیا ہے۔

تھوڑی دیر بعد حامی کا چہرہ پُرسکون ہو گیا۔ شاید وہ سو گئی تھی۔

راشد نے انہیں دوسرے کمرے میں چلنے کا اشارہ کیا۔ پھر وہ بھی اپنا بیگ اٹھا کر اور ممانی کی بہن کو حامی کے قریب بٹھا کر ان کے پیچھے دوسرے کمرے میں چلا آیا۔

وہ تینوں صوفوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

راشد نے ایک سگریٹ نکال کر اسے سلگایا پھر ایک گہرا کش لینے کے بعد بولا۔

"وہ اپنی یادداشت کھو چکی ہے۔"

ماموں اور ممانی چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

اس نے دوسرا کش لینے کے بعد دھواں چھوڑتے ہوئے سوال کیا۔

"اس کے دماغ پر چوٹ پہنچی ہے۔ سر سے بہت زیادہ خون بہہ چکا ہے۔ وہ جسمانی اور ذہنی طور پر اس قدر کمزور ہو چکی ہے کہ فی الحال اسے اس حادثہ کی تفصیل بتانا مناسب نہیں ہے۔ خواہ مخواہ اس کے ذہن پر زور پڑے گا۔ وہ اس قابل نہیں ہے کہ کسی ناگوار حادثہ کے متعلق سوچ سکے۔"

ممانی نے بے چینی سے پہلو بدل کر پوچھا۔

"مگر ڈاکٹر صاحب! وہ ہمیں تو پہچان سکتی ہے کیونکہ ہم نے بچپن سے اس کی پرورش کی ہے۔"

"میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ وہ یادداشت کھو چکی ہے۔ یعنی وہ اپنا ماضی بھول چکی ہے۔ وہ خود اپنے آپ کو نہیں پہچان رہی ہے۔ پھر آپ کو کیسے پہچانے گی؟"

"اب کیا ہو گا؟" ماموں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "ہماری لڑکی ہمیں نہیں پہچانے گی۔ ہمارے رشتے سے انکار کرے گی تو دنیا والے یہی سوچیں گے کہ ہم نے جبراً اسے بیٹی بنا کر رکھا ہے۔"

راشد نے مسکرا کر کہا۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ جب وہ نیند سے بیدار ہو گی تو پہلے سے زیادہ پُرسکون ہو گی۔ آپ لوگ اسے بتائیں کہ آپ اس کے والدین ہیں ظاہر ہے کہ کوئی اور والدین بننے کا دعویٰ کرنے نہیں آئے گا۔ اسے یقین کرنا ہی ہو گا کہ وہ آپ کی بیٹی ہے لیکن ایک بات کا خیال رکھیں کہ ماضی کے متعلق اسے زیادہ سوچنے کا موقع نہ دیں۔ اگر وہ زیادہ سوچے گی اور اپنے ذہن پر زور ڈالے گی تو ہو سکتا ہے کہ وہ پاگل ہو جائے۔"

"میرا مشورہ ہے کہ کل ہی اسے کسی ہسپتال میں داخل کرا دیں۔ اسے خون کی سخت ضرورت ہے۔ وہ آہستہ آہستہ صحت یاب ہو گی۔ آہستہ آہستہ اس کا ماضی اسے یاد آئے گا۔ پھر وہ ہر ایک کو جاننے اور پہچاننے لگے گی۔ فی الحال اتنا ہی کافی ہے کہ وہ آپ لوگوں کو ماں باپ کی حیثیت سے تسلیم کر لے۔"

وہ دونوں اس کے مشورے پر غور کرنے لگے۔ پھر ماموں نے کہا۔

"لیکن راشد صاحب! ہسپتال میں اگر پوچھا گیا کہ لڑکی کیسے زخمی ہوئی تھی تو ہم کیا جواب دیں گے؟"

راشد نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بھئی معمولی سی بات ہے۔ کوئی بہانہ کر دیجئے گا۔ کوئی بھی بہانہ مثلاً...... مثلاً یہ کہ لڑکی غسل خانے میں پھسل کر گر پڑی تھی۔ دیوار کے قریب ایک ٹوٹی ہوئی بوتل رکھی تھی جس سے اس کا سر زخمی ہو گیا۔"

ممانی نے خوش ہو کر کہا۔

"ہاں' یہ بہت اچھا بہانہ ہے۔"

راشد اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنا بیگ اٹھا کر بولا۔

"آپ لوگوں کی قسمت اچھی ہے۔ لڑکی بھی آپ لوگوں کے خلاف نہیں بولے گی کیونکہ وہ حادثے کی نوعیت بھول چکی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ خدا حافظ کہتا ہوا رخصت ہو گیا۔

ماموں نے باہر کا دروازہ بند کر دیا اور واپس آ کر اپنی بوڑھی بیگم کے پاس بیٹھ گئے۔ بیگم صاحبہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

ماموں نے کہا۔

"سوچا جائے تو حامی نے ایک نیا جنم لیا ہے۔ اب یہ دنیا اس کے لئے نئی ہے۔ اس دنیا کا ہر رشتہ اس کے لیے نیا ہے۔ جب وہ بیدار ہو گی تو سب سے پہلے ہم ہی ماں باپ کی حیثیت سے اس کے سامنے رہیں گے۔ ہمارے سوا اور کون ہے جسے وہ اپنا کہے گی۔ کیوں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔"

انہوں نے اپنی بیگم کی طرف دیکھا مگر وہ اسی طرح سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

ماموں نے ان کا شانہ جھنجھوڑ کر کہا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"آں؟" وہ چونک گئیں پھر بولیں۔ "میں سوچ رہی ہوں کہ بات بگڑی نہیں بلکہ بن گئی ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"سنو میں بتاتی ہوں۔"

وہ ماموں کے قریب کھسک آئیں' ماموں ان کے قریب کھسک آئے۔

پھر ان دونوں کے سر آپس میں مل گئے۔

پھر ممانی کے ہونٹ دھیمی سرگوشی میں اس طرح ہلنے لگے جیسے وہ کوئی منتر پڑھ رہی ہوں۔

اس منتر کے زیراثر ماموں کا سر تائیدی انداز میں ہلتا جا رہا تھا اور ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوتی جا رہی تھی۔

☆============☆============☆

کمال ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کی والدہ اور صفدر پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے اور آپس میں ہنس بول رہے تھے مگر صفدر کی نظریں راستے پر تھیں۔ حامی کے دیئے ہوئے پتہ کے مطابق وہ راستوں کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

پھر کار ایک گلی میں داخل ہوئی اور ایک مکان کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔

صفدر کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

یہ تو وہی گلی تھی' مکان کا نمبر بھی وہی تھا جو حامی نے بتایا تھا۔

اس کا دل ڈوبنے لگا۔ یااللہ! کہیں کمال نے حامی کو تو نہیں پسند کر لیا ہے؟ یا اس گھر میں کوئی دوسری لڑکی بھی رہتی ہے؟

کمال نے کار کا ہارن دیا۔ ہارن کی آواز کے ساتھ دروازہ کھلا اور ماموں اور مانی ان کے استقبال کے لیے دوڑے چلے آئے۔

انہیں دیکھتے ہی صفدر کا دل دھک سے رہ گیا۔

کمال کار سے باہر آ کر ماموں سے مصافحہ کر رہا تھا۔ اس کی والدہ بھی مسکراتی ہوئی کار سے باہر آئیں۔ کمال ممانی سے ان کا تعارف کرانے لگا۔

صفدر ان کی خوشیاں دیکھ رہا تھا۔ کمال اس کا دوست بھی تھا اور محسن بھی۔ اس کی والدہ بھی اسے بیٹے کی طرح چاہتی تھیں۔

کیا وہ اس شریف خاتون کی ممتا کو یہ کہہ کر مایوس کر سکتا تھا کہ وہ حامی کو اپنے بیٹے کی دلہن نہ بنائیں؟

کمال نے کار کے دروازے سے اندر جھانک کر ہولے سے کہا۔

"یار! سسرال میرا ہے اور تم شرما رہے ہو۔ کیا کار سے باہر نہیں آؤ گے؟"

"آں.... ہاں کیوں نہیں!" وہ جلدی سے باہر آ گیا۔

اسے دیکھتے ہی ماموں اور ممانی کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ لمحہ بھر کے لیے وہ گھبرائے مگر پھر سنبھل کر مسکرانے لگے۔ بظاہر صفدر سے یوں انجان ہو گئے جیسے پہچانتے نہ ہوں۔

کمال کی والدہ نے ممانی سے کہا۔

"یہ کمال کا دوست ہے' صفدر۔ اسے بھی میرا ہی بیٹا سمجھئے۔"

صفدر نے ماموں کی طرف مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا کر طنزیہ انداز میں کہا۔

"شاید میں نے پہلے بھی آپ کو کہیں دیکھا ہے؟"

ماموں نے ڈھیٹ بن کر مصافحہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

"ہو سکتا ہے کہ تم نے کہیں دیکھا ہو۔ یہ دنیا بہت بڑی ہے۔ لوگ ملتے اور بچھڑتے رہتے ہیں۔ ہر ایک کو یاد رکھنا مشکل ہے۔"

کمال نے ہنستے ہوئے کہا۔

"انکل یہ کوئی بھولنے والی چیز نہیں ہے۔ میرا دوست لاکھوں میں ایک ہے۔ مجھ پر جان دیتا ہے۔ جہاں میرا پسینہ گرے وہاں خون بہانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔"

یہ حقیقت تھی۔ صفدر اس کے لیے اپنا خون بہا سکتا تھا۔ کمال کی بات سن کر اسے محسوس ہوا جیسے وہ ابھی اور اسی وقت اسے کہہ رہا ہے کہ اپنی محبت کا خون کر دو۔

ماموں نے مسکرا کر کہا۔

"بھئی' زبانی دعوے تو تمام دوست کرتے ہیں۔ آزمائش کے وقت ہی پتہ چلتا ہے کہ کون کس کے لیے قربانی دیتا ہے۔"

صفدر پریشان ہو گیا۔ ماموں اس کی دوستی کو چیلنج کر رہے تھے۔

ممانی نے ہاتھ نچا کر کہا۔

"یہ کیا فضول باتیں چھڑ گئیں۔ آیئے بہن! میرے غریب خانے میں چلئے۔ آپ نے یہاں آ کر میری عزت بڑھا دی ہے۔"

وہ کمال کی والدہ کا ہاتھ پکڑ کر مکان کے اندر جانے لگیں۔ ان کے پیچھے کمال' صفدر اور ماموں بھی چلنے لگے۔

چھوٹا سا ڈرائنگ روم بڑا ہی صاف ستھرا تھا۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر نئے پردے لگے ہوئے تھے۔ گلدانوں میں تازہ پھول مہک رہے تھے اور ایک طرف رکھے ہوئے ٹرانزسٹر سے ہلکی ہلکی موسیقی ابھر رہی تھی۔

صفدر کی نگاہیں کسی کو تلاش کرنے لگیں۔ اس کا دل پوچھ رہا تھا' کیا حامی اس رشتے کو منظور کرلے گی؟

کمال کی والدہ نے ممانی کے ساتھ ایک صوفہ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کمال آپ لوگوں کی بڑی تعریفیں کر رہا تھا۔ یہ میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ جو چاہتا ہے مجھ سے منوا لیتا ہے۔ آج اس کی خوشی کے لیے میں آپ کے دروازے پر سوالی بن کر آئی ہوں۔"

"آپ ہمیں شرمندہ نہ کریں۔" ممانی نے کہا۔ "آپ سوالی بن کر نہیں' میری بہن بن کر آئی ہیں۔ اس گھر کی ہر چیز آپ کی ہے۔ جو چاہے اٹھا کر لے جائیں۔ ہماری طرف سے انکار نہیں ہوگا۔"

کمال کی والدہ نے مسکرا کر کہا۔

"ایسی بات ہے تو پھر لڑکا آپ کا اور لڑکی میری ہوگئی۔"

ماموں اور ممانی کی باچھیں کھل گئیں۔ کمال کا چہرہ خوشی سے تمتمانے لگا مگر صفدر کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ وہاں سب لوگ اپنی خوشیوں میں اس طرح مگن ہوگئے تھے کہ کسی نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔

اس کا دل اب تک یہی سوال کر رہا تھا۔ کیا حامی بھی اس رشتے سے خوش ہے؟

کمال کی والدہ نے کہا۔

"بہن! لڑکے کو تو آپ نے دیکھ ہی لیا ہے۔ اب لڑکی بھی مجھے دکھا دیجئے۔"

"ہاں' ہاں۔ کیوں نہیں؟" ممانی نے کہا۔ "ایک نہیں ہزار بار دیکھئے۔ مگر ایک بات ہے بہن۔ لڑکی کل سے اچانک بیمار ہوگئی ہے۔"

صفدر چونک کر ممانی کو دیکھنے لگا۔ حامی بیمار ہے۔ کیا ہوگیا ہے میری حمیدہ کو؟

کمال بھی کچھ پریشان نظر آنے لگا۔ اس کی والدہ نے بھی تشویش کا اظہار کیا۔

"وہ کیسے بیمار ہوگئی؟"

"کیا بتاؤں بہن' حادثے پوچھ کر نہیں ہوتے۔ کل رات کو وہ غسل خانے میں پھسل کر گر پڑی۔ دیوار کے پاس ایک ٹوٹی ہوئی بوتل رکھی تھی۔ سر اس پر جا پڑا۔ ایسا خون نکلا ہے کہ خدا کی پناہ۔ رات ہی رات میں ایسی ہوگئی ہے جیسے برسوں کی بیمار ہو۔"

"ہائے اللہ! بیچاری پر کیا مصیبت آئی ہے۔" کمال کی والدہ اٹھ کر کھڑی ہوگئیں اور ممانی کے ساتھ دوسرے کمرے میں جانے لگیں۔

صفدر بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ وہ چاہتا تو بلا جھجک ابھی وہاں سے اٹھ کر حامی کے پاس چلا جاتا۔ ماموں اسے روک نہیں سکتے تھے لیکن کمال اور اس کی والدہ کی موجودگی میں وہ کس رشتے سے حامی کے پاس جاتا؟

حامی تو اس وقت ایک پرائی لڑکی تھی۔

اور اگر پرائی نہیں تھی تو وہاں تک جانے کے لیے اسے پہلے دوستی کے رشتے کو توڑنا پڑتا۔ پھر اس ممتا اور محبت سے انکار کرنا پڑتا جو کمال کی والدہ نے اسے دی تھی۔ یہ دونوں ماں بیٹے اسے اس قدر چاہتے تھے کہ اس کی محبوبہ کو حاصل کرنے کے لیے پندرہ ہزار روپے دینے کو تیار ہوگئے تھے۔ ان بے چاروں کو کیا معلوم تھا کہ وہ اسی محبوبہ کو اپنے گھر کی بہو بنا رہے ہیں۔ وہ دونوں اپنی جگہ دیانت دار تھے۔ اب صفدر کی دیانت داری اور محبت کا امتحان تھا۔ صرف اتنا سا فیصلہ کرنا تھا کہ جو لوگ اس کی خوشیوں کے لیے اپنی دولت لٹا سکتے ہیں' کیا وہ ان کی خوشیوں کو برباد کر سکتا ہے؟

اور یہی فیصلہ وہ اب تک نہیں کر سکا تھا۔ بار بار اسی اعتماد سے بہل رہا تھا کہ شاید حامی کی طرف سے انکار ہو جائے۔ اگر حامی کی طرف سے بات کھل گئی تو اسے بھی اعتراف کرنا پڑے گا۔ محض ایک طرفہ فیصلے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اپنی زبان سے کچھ کہتے ہوئے بھی برسوں کی دوستی اور مروت آڑے آتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد کمال کی والدہ بڑبڑاتی ہوئی واپس آئیں۔ ان کے لہجے میں خوشی بھی تھی اور گھبراہٹ بھی۔ وہ کہہ رہی تھیں۔

"میرے اللہ! کیسی گڑیا سی لڑکی ہے۔ ایسی موہنی صورت تو میں نے بھی کبھی نہیں

دیکھی۔ کمال! چلو اٹھو۔ جلدی سے ایک ایمبولینس لے آؤ۔"

کمال گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

"خیریت تو ہے امی؟"

خیریت کیا ہوگی۔ وہ تو ایسی سفید پڑ گئی ہے جیسے سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ اسے فوراً ہی ہسپتال لے جانا ہوگا۔ تم یو سی ایچ میں ایک کمرہ بک کرا لینا۔ ہائے' بیچاروں پر کیا مصیبت آئی ہے۔ ایک تو سیلاب سے تباہ ہو گئے' دوسرے لڑکی کو یہ حادثہ پیش آ گیا۔ خدا دشمنوں پر بھی ایسی مصیبت نہ لائے۔"

ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کمال تیر کی طرح کمرے سے نکل کر جا چکا تھا۔ اس کی والدہ پھر حامی کے کمرے میں چلی گئیں۔

صفدر گم صم بیٹھا رہ گیا۔ اب اس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ حامی کس قدر بیمار ہے۔ اس قدر بیمار ہے کہ شاید وہ پوری طرح اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے۔ اگر ذرا بھی اس کے حواس بجا ہوتے تو وہ ضرور اس رشتے سے انکار کر دیتی۔ وہ بے وفا نہیں ہے۔ اس نے جو وعدہ کیا ہے اسے ضرور نبھائے گی۔

بے وفا تو کوئی بھی نہیں تھا۔

وعدہ حامی نے بھی کیا تھا اور صفدر نے بھی کیا تھا۔ "جئیں گے تو ایک ساتھ' مریں گے تو ایک ساتھ۔" بہت ہی مستحکم وعدہ تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ وعدہ کہاں سے ٹوٹتا ہے؟ کس کی طرف سے وعدہ شکنی ہوتی ہے؟

ابھی دونوں طرف سے خاموشی تھی۔ صفدر دوستی اور مروت کی الجھن میں گرفتار تھا اور حامی بیماری کے پردے میں چھپی ہوئی تھی۔

اس وقت ڈرائنگ روم میں صفدر اور ماموں تنہا رہ گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ماموں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب گئے اور آہستگی سے کہنے لگے۔

"تم واقعی سمجھ دار ہو۔ ایک سچے دوست کی طرح دوستی نبھا رہے ہو۔"

صفدر نے انہیں گہری نظروں سے دیکھا اور کہا۔

"میرے دوستی نبھانے سے کچھ نہیں ہوتا۔ حامی نے انکار کر دیا تو میری دوست نوازی کسی کام کی نہیں رہے گی۔"

ماموں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تم بھی کیسے نادان ہو۔ اگر اسے انکار کرنا ہوتا تو اب تک کر چکی ہوتی۔ وہ اس رشتے سے مطمئن ہے۔"

"میں نہیں مانتا۔"

"جب وہ منگنی کی انگوٹھی پہنے گی تو مان جانا۔"

صفدر بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔

"میں...... میں اس سے ایک بار ملنا چاہتا ہوں۔"

ماموں نے طنزیہ کہا۔

"تم اپنے دوست کے لیے رشتہ مانگنے آئے ہو۔ ایک نہیں' ایک ہزار بار اس سے ملو۔ اب تو وہ ہسپتال جا رہی ہے۔ وہاں اس کی عیادت کے لیے جب چاہو' چلے آنا۔ ہماری طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔"

ماموں بڑی فراخدلی کا ثبوت دے رہے تھے۔ صفدر کا اعتماد ڈگمگانے لگا کہ حامی کیا واقعی کمال کے رشتہ کو قبول کر رہی ہے؟

اس وقت کمال کی والدہ' ممانی سے باتیں کرتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آ گئیں۔ انہوں نے اپنی رسٹ واچ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"بس اب کمال آتا ہی ہوگا۔ آپ لوگ بالکل فکر نہ کریں۔ حامی اب میری بیٹی ہے۔ میں اس کے علاج کے لیے دن رات ایک کر دوں گی۔"

"ہم آپ کا احسان کبھی نہیں بھولیں گے۔" ماموں نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

"احسان کیسا؟" انہوں نے جواب دیا۔ "وہ میری بہو ہے۔ میری دولت اس کے کام نہ آئے گی تو پھر کس کے کام آئے گی۔ ارے ہاں!" انہوں نے صفدر کو دیکھ کر کہا۔ "میں تو بتانا ہی بھول گئی۔ میرے گھر میں ایک اور بہو آنے والی ہے۔ صفدر نے بھی ایک لڑکی پسند کی ہے۔"

ماموں مسکرا کر اسے دیکھنے لگے۔ پھر انہوں نے طنزیہ کہا۔

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ مگر یک طرفہ پسند سے کچھ نہیں ہوتا۔ لڑکی بھی اس رشتے کے لیے راضی ہے یا نہیں؟"

"وہ بے چاری تو بڑی مظلوم ہے۔ اس نے خود ہی صفدر کا سہارا مانگا ہے مگر اس کے ماموں اور ممانی بڑے کمینے ہیں۔"

ممانی تلملا کر صفدر کو دیکھنے لگیں۔ ماموں بے غیرت تھے۔ اس لئے اس گالی کو ہضم کر گئے۔

انہوں نے پوچھا۔

"کیوں' کمینے کیوں ہیں؟"

"اس لئے کہ لڑکی کو عزت و آبرو سے ڈولی میں بٹھا کر رخصت کرنے کی بجائے اسے غنڈوں کے ہاتھ بیچنا چاہتے ہیں۔ میں تو آج شام کو صفدر کے ساتھ ان کے ہاں جاؤں گی اور ان کے منہ پر پندرہ ہزار پھینک کر لڑکی کو لے آؤں گی۔ توبہ ہے' اپنی ہی سگی بھانجی کو کنجروں کو طرح بیچ رہے ہیں۔ خدا ایسوں کو غارت بھی نہیں کرتا۔"

کمال کی والدہ کو کیا معلوم تھا کہ جنہیں وہ لعن طعن کر رہی ہیں وہ بے غیرت ماموں اور ممانی ان کے ہی سامنے بیٹھے ہیں۔ صفدر ان کی تذلیل سے محظوظ ہو رہا تھا اور انہیں بڑی ہی زہریلی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

پھر اسی وقت کمال ایمبولینس لے کر آگیا۔ اس کی والدہ اور ممانی اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ انہوں نے بیرونی دروازے کی طرف دیکھا۔ کمال اسٹریچر اٹھائے آرہا تھا۔ اس نے کہا۔

"ایمبولینس تو مل گئی مگر اسٹریچر اٹھانے والے ملازم نہ مل سکے۔ کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ اس لئے میں نے سوچا کہ ہم ہی اٹھا کر لے جائیں گے۔"

"تم نے بہت اچھا کیا۔" اس کی والدہ نے کہا۔ "چلو! تم اور صفدر اسے اسٹریچر میں ڈال کر لے چلو۔"

صفدر کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اسے حامی کے قریب جانے کا موقعہ نصیب ہو رہا تھا۔ حامی! وہ کس حال میں ہوگی؟ مجھے دیکھ کر اس کا رد عمل کیا ہوگا؟ اگر وہ بے وفا ہوئی تو کیا مجھ سے نظریں ملا سکے گی؟

"صفدر! تم اس طرح بیٹھے کیوں ہو' چلو اٹھو!" کمال کی والدہ نے کہا۔

صفدر چونک کر کھڑا ہو گیا۔ کمال کی والدہ اور ممانی آگے آگے چلتی ہوئی دوسرے

کمرے کی طرف جانے لگیں۔ ان کے پیچھے کمال چلنے لگا اور کمال کے پیچھے صفدر ڈگمگاتے قدموں سے بڑھنے لگا۔

حامی آنکھیں بند کئے ہوئے چارپائی پر پڑی ہوئی تھی۔

اس حسن خوابیدہ کو دیکھ کر صفدر اور کمال دونوں ہی لمحہ بھر کے لیے ٹھٹک گئے۔ وہ نیند کی حالت میں اتنی خوبصورت اور معصوم نظر آ رہی تھی کہ اسے دیکھتے ہی رہنے کو جی چاہ رہا تھا۔ اس کا اجلا چہرہ نگاہوں کے سامنے کرن کرن جگمگا رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے تھے اور آہستہ آہستہ سانسوں کے اتار چڑھاؤ سے لرز رہے تھے۔

ان کی آہٹ سن کر حامی نے آنکھیں کھول دیں۔

اس کے سامنے دو نوجوان کھڑے ہوئے تھے۔ پہلے اس کی نظر کمال پر گئی۔ پھر وہاں سے پھسلتی ہوئی صفدر پر آئی۔ صفدر کی آنکھوں میں محبت کے بکھرے ہوئے سارے جذبے سمٹ آئے۔ اس سے نظریں ملتے ہی حامی ایک ساعت کے لیے چونکی۔ پھر اس کی آنکھوں سے ایک ایسا تجسس ظاہر ہونے لگا جیسے وہ صفدر کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

ممانی نے جلدی سے آگے بڑھ کر کہا۔

"بھئی جلدی کرو۔ باہر ایمبولینس کھڑی ہے۔"

کمال کی والدہ نے مسکرا کر کہا۔

"لڑکی کو دیکھ کر دونوں شرما رہے ہیں۔ ان کا اس طرح جھجکنا بھی ایک فطری بات ہے۔ بہرحال حامی کو اٹھا کر تو لے جانا ہی ہوگا۔"

کمال کی خواہش تھی کہ وہ آگے بڑھ کر حامی کو دونوں بازوؤں میں اٹھا لے۔ اسے اٹھانے اور اسٹریچر میں ڈالنے تک کا وقفہ اتنا حسین ہوتا کہ وہ اپنی ہونے والی دلہن کے بالکل قریب آجاتا۔ مگر وہ اپنی والدہ کی موجودگی میں ہچکچا رہا تھا۔

اس نے بے بسی سے صفدر کی طرف دیکھ کر کہا۔

"بھئی کھڑے کیوں ہو' تم اٹھاؤ۔"

کمال کی والدہ نے تائید کی۔

"ہاں' صفدر کو ہی اٹھانا چاہئے۔ چلو دیر نہ کرو۔"

صفدر چارپائی کے قریب آگیا اور حامی کی طرف جھکنے لگا۔ حامی کی نگاہوں میں اب

بھی وہی تجسس تھا۔ چہرے پر کشمکش کے آثار تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے اندر ایک ذہنی جنگ جاری ہے اور صفدر کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہے۔

صفدر نے اس کشمکش اور پریشانی کا مطلب کچھ اور لیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ حامی اس کی موجودگی سے پریشان ہو گئی ہے اور اس وقت کچھ کہنے سننے سے گریز کر رہی ہے۔

"ذرا سنبھال کر اٹھانا۔ سر کا زخم ابھی کچا ہے۔" کمال کی والدہ نے کہا۔

سنبھلنے اور سنبھال کو اٹھانے میں کافی وقت صرف ہو گیا۔ اس نے بڑی آہستگی سے اس کی گردن کے نیچے اپنا ہاتھ رکھا۔ وہ اجلی اجلی سی گردن اس لئے تھی کہ وہ اپنے بازو حمائل کر دے لیکن محبوب بن کر نہیں۔ اجنبی مزدور بن کر۔ وہ مزدور بن کر ہی اس کی زندگی میں آیا تھا اور مزدور بن کر ہی اسے اٹھا رہا تھا۔

یہ ماموں کا فرض تھا کہ اسے اٹھا کر اسٹریچر پر ڈالتے۔ مگر حامی جیسی جوان اور بھاری بھرکم لڑکی کو اٹھانا ان کی طاقت سے بعید تھا۔ وہ صرف شراب کی بوتل اٹھا سکتے تھے۔ صفدر کا دوسرا ہاتھ اس کے کولہوں کے نیچے سے رینگ گیا۔ جسم کیا تھا' ایک چیلنج تھا۔ ایسی شادابیوں سے بھرپور تھا کہ دیکھنے والوں کی نگاہیں کانپ کانپ جاتی تھیں اور یہاں تو دیکھنا کیا؟ وہ اسے چھو رہا تھا' سمیٹ رہا تھا اور پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔

پھر اس نے بڑی آہستگی سے اٹھا لیا۔ دو جسم بازوؤں کے سنگم پر آ کر مل گئے۔ ذرا دیر کے لیے۔ چند لمحوں کے لیے۔ جیسے وہ سفر کے دوران وقت کی مہربانیوں سے قریب آئے تھے۔ اسی طرح وقتی طور پر چارپائی اور اسٹریچر کے درمیان آ کر مل گئے تھے۔ بچھڑنے کے لیے......

اے خدا! تو انصاف والا ہے۔ تو میری مزدوری کی لاج رکھ لے۔ میں محنت کا معاوضہ نہیں چاہتا' محبت کا معاوضہ چاہتا ہوں۔

اس نے اسٹریچر پر حامی کو لٹا دیا۔

کمال نے سرہانے آ کر سٹریچر کو تھام لیا۔ صفدر نے پائنتی آ کر اس کے ہینڈلز کو پکڑا پھر وہ دونوں اسٹریچر کو اٹھا کر چلنے لگے۔

کمال آگے تھا۔ صفدر پیچھے تھا اور اس کے ٹھیک سامنے حامی نظریں جھکائے اسٹریچر پر پڑی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی وہ اپنی گھنی پلکیں اٹھا کر اس مزدور کو دیکھتی اور پھر کسی الجھن

کا شکار ہو کر نظریں جھکا لیتی تھی۔

صفدر کے سینے سے ایک خاموش آہ نکلی۔

وہ بیک وقت اپنے دوست کی دلہن کی ڈولی بھی اٹھا رہا تھا اور اپنی محبت کا جنازہ بھی......

☆-----------☆-----------☆

کمال کی والدہ زبیدہ خاتون کے سینے میں ایک بہت ہی حساس دل تھا۔ یہ دل اپنے اور پرائے پر ایک سی محبت میں تڑپتا تھا۔

حامی اگرچہ ایک پرائی لڑکی تھی لیکن اب ان کے لیے پرائی نہیں رہی تھی۔ انہوں نے اس کے لیے یو سی ایچ میں ایک ائرکنڈیشنڈ کمرہ لے لیا تھا۔ اس ہسپتال میں حامی کے گروپ کا خون موجود نہیں تھا۔ اس لئے وہ دوسرے تمام بلڈ بینکس سے خون حاصل کرنے کے لئے دوڑتی پھر رہی تھیں۔ اتنی مصروفیت میں انہیں یہ بھی یاد تھا کہ صفدر کے ساتھ جا کر اپنی دوسری بہو کو بھی لانا ہے۔

لیکن صفدر انہیں دوسری بہو کی تلاش کے لئے اب کہاں لے جاتا؟ وہ تو ہسپتال میں پڑی ہوئی تھی۔ اس نے زبیدہ خاتون کی مصروفیات سے فائدہ اٹھا کر کہا۔

"آنٹی! جب تک حامی کو خون نہیں دیا جاتا' آپ کا یہاں رہنا بہت ضروری ہے۔ نہ جانے کس وقت کس چیز کی ضرورت پڑ جائے۔"

"ہاں...... مگر......!" انہوں نے پریشانی سے کہا۔ "تمہارے ساتھ جانا بھی ضروری ہے۔"

"کوئی ضروری نہیں ہے۔" اس نے سمجھایا۔ "کام تو صرف اتنا ہی ہے کہ وہاں جانا ہے اور پندرہ ہزار دے کر لڑکی کو یہاں لے آنا ہے۔ یہ کام تو میں تنہا بھی کر سکتا ہوں۔"

"ٹھیک تو ہے امی!" کمال نے کہا۔ "آپ کو یہاں رہنا چاہئے' میں صفدر کے ساتھ چلا جاتا ہوں۔"

صفدر گھبرا کر اسے دیکھنے لگا پھر اس نے سنبھل کر کہا۔

"نہیں' تم اپنا کام کرو۔ میں تنہا چلا جاؤں گا۔"

کمال نے اس کا بازو جھنجھوڑ کر کہا۔

"صاف کیوں نہیں کہتے کہ اپنی دلہن کو مجھ سے چھپانا چاہتے ہو۔ دیکھئے امی! میں کہہ دیتا ہوں' جھگڑا ہو جائے گا' ہاں!"

"بھئی جھگڑا نہ کرو۔" زبیدہ خاتون نے کہا۔ "صفدر اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔"

صفدر نے پھر بات بنائی۔

"آنٹی! ڈاکٹر نے ڈھیر ساری دوائیں لکھ دی ہیں۔ کمال سے کہئے کہ پہلے بازار سے جا کر یہ دوائیں خریدے۔"

"دوائیں خریدنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ وہ تو ہم راستے میں ہی خرید لیں گے۔"

"جی نہیں!" صفدر نے جواب دیا۔ "صرف دوائیں نہیں خریدنا ہوں گی۔ ہارلکس' گلوکوز اور تازہ پھل بھی خریدنے ہیں۔ شادی کرنے والے ہو تو گھر گرہستی بھی سیکھو۔ یہاں حامی کو بہت سی چیزوں کی ضرورت بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً منہ ہاتھ دھونے کے پیسٹ برش صابن' تولیہ' تیل اور کنگھی وغیرہ۔ کیوں آنٹی! کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"ہاں' مجھے تو ان چیزوں کا خیال ہی نہیں رہا۔" زبیدہ خاتون نے کہا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔ کمال! صفدر کو اکیلے ہی جانے دو۔ تم یہ ضرورت کی چیزیں پہلے خرید لاؤ۔"

"اچھی بات ہے۔ میں انارکلی سے چیزیں لے آؤں گا۔"

"تم ابھی کوٹھی میں جاؤ۔ آج میں نے بینک سے پندرہ ہزار نکلوا کر اپنی الماری میں رکھے ہیں۔ وہ روپے تم صفدر کو دے دینا۔"

انہوں نے اپنے وینٹی بیگ سے الماری کی چابیاں نکال کر کمال کو دے دیں اور انہیں جلد واپس آنے کی تاکید کرتی ہوئی ہسپتال کے اندر چلی گئیں۔

صفدر اور کمال کار میں آ کر بیٹھ گئے۔

کمال نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"یار! صبح سے ایسی مصروفیت رہی کہ تم سے تنہائی میں باتیں کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اب سچ سچ بتاؤ کہ میری پسند کیسی ہے؟"

کار یو سی ایچ کے کمپاؤنڈ سے باہر آ کر تیزی سے دوڑنے لگی۔

صفدر نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"بہت اچھی ہے۔"

"بھئی تم ٹھنڈی سانس لے کر نہ کہو۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے......"

ایک موڑ کاٹتے ہوئے اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ صفدر نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

"اس میں سمجھنے کی کیا بات ہے۔ صاف ظاہر ہے۔"

"کیا ظاہر ہے؟" اس کی گھبراہٹ بڑھ گئی۔

"یہی کہ میری پسند کے سامنے تمہاری محبوبہ پھیکی پڑ گئی ہے۔ اسی لئے تم ٹھنڈی آہیں بھر رہے ہو۔"

صفدر ایک اطمینان کی سانس لے کر سیٹ کی پشت سے ٹک گیا۔ پھر اس نے کہا۔

"یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔ میری محبوبہ تمہاری حامی سے کسی طرح کم نہیں ہے۔"

"اچھا!"

"ہاں' بلکہ یوں سمجھ لو کہ اس کا ناک نقشہ بھی بالکل ایسا ہی ہے۔"

"جاؤ یار' کیوں مذاق کرتے ہو۔"

"مذاق ہی سہی۔ مگر کبھی کبھی وقت' مذاق کو حقیقت میں بدل دیتا ہے۔ اگر تم میری محبوبہ کو دیکھو گے تو تمہیں یہی محسوس ہو گا کہ وقت نے تمہارے ساتھ بھی مذاق کیا ہے۔"

کمال نے تعجب سے پوچھا۔

"کیا واقعی وہ حامی سے ملتی جلتی ہے؟"

صفدر حامی کے تصور میں کھو گیا۔

"ہاں' وہ ہوبہو حامی ہے۔ وہی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں' جو نظریں جھکائے تو شرمیلی اور نظریں اٹھائے تو شرابی آنکھیں کہلائیں' چہرہ دمکتا ہوا اور رخسار حیا کی آنچ سے تپتے

ہوئے' رس بھرے پتلے تراشیدہ لب' جو کھلیں تو پھول کی طرح گفتار سے مہکتے رہیں اور بند ہوں تو کلیوں کا سمٹنا یاد آ جائے۔"

کمال نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

"یار' یہ تعریفیں سن کر پتہ چلتا ہے کہ وہ حامی سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔"

"نہیں!" صفدر نے جواب دیا۔ "وہ حامی ہی کی طرح خوبصورت ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تم نے اپنی محبوبہ کو صرف محبت کی نظروں سے دیکھا ہے۔ میں نے اسے صرف محبت سے ہی نہیں شاعر کی نظروں سے بھی دیکھا ہے۔ پھول سب کے لیے پھول ہوتا ہے لیکن اس کی خوبصورتی صرف شاعر کی زبان سے سمجھی جاتی ہے۔"

"ہاں' تم ٹھیک کہتے ہو۔ معلوم ہوتا ہے اب مجھے بھی شاعری کی کتابیں کھولنا ہوں گی۔"

کار کوٹھی کے پورچ میں آ کر رک گئی۔

"چلو' اترو!" کمال نے کہا۔ "اپنے روپے گن کر لے آؤ۔"

"نہیں بھئی۔ تم جا کر لے آؤ۔"

کمال نے مسکرا کر پوچھا۔

"کیوں' تنہائی میں اسے یاد کرنا چاہتے ہو؟"

"ہاں!" صفدر نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "وہ دنیا والوں سے ڈرتی ہے مگر تنہائی میں میرے پاس چلی آتی ہے۔"

"یار' تمہارا بھی جواب نہیں ہے۔ اچھا میں یہ گیا اور یہ آیا۔" وہ ہنستا ہوا چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی صفدر کا چہرہ مرجھا گیا۔ وہ صبح سے جبراً مسکرا رہا تھا۔ نہ مسکراتا اور اداس ہو جاتا تو کمال اور زبیدہ خاتون کے سامنے اپنی اس اداسی کا جواز کہاں سے پیش کرتا؟ وہ عجیب حالات سے دوچار تھا۔ اندر ہی اندر رو رہا تھا اور اوپر ہی اوپر مسکرا رہا تھا۔

اسے حامی کا رویہ یاد آنے لگا۔

کیا وہ سچ مچ بدل گئی ہے؟ مجھے یقین نہیں آتا۔ سفر کے دوران اس نے کتنی شدت اور کتنی اپنائیت سے محبت کا اظہار کیا تھا۔ مگر آج اس کی نظروں میں وہ اپنائیت نام کو نہیں تھی۔ وہ مجھے ایسے دیکھ رہی تھی جیسے مجھے جانتی نہ ہو۔ بلکہ جاننے اور پہچاننے کی

کوشش کر رہی ہو۔ اتنی جان پہچان کے باوجود انجان بننے کا مطلب یہی ہے کہ اسے اب میری ذات سے دلچسپی نہیں رہی۔ اب وہ کمال سے منسوب ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔

اف! یہ لڑکیاں اپنے چہروں سے اور اپنی لچھے دار باتوں سے پہچانی نہیں جاتیں۔ دولت کی چمک دمک کے سامنے ہی ان کا اصلی چہرہ بے نقاب ہوتا ہے لیکن میں کیا کروں؟ اب بھی مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ بے وفا ہے۔ اس بے وفا نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ مگر میں اپنے دل کو کیسے سمجھاؤں؟

دل کو سمجھانا واقعی ایک مشکل کام ہے۔ یہ صفدر کے بس میں نہیں تھا کہ وہ حامی کو بھول جائے یا کم از کم وقتی طور پر اسے نظرانداز کر دے۔ تنہائی میں گزارا ہوا محبت کا ایک ایک لمحہ یاد آ کر سمجھاتا ہے کہ انسان بے وفا ہو سکتا ہے لیکن وہ لمحے بے وفا نہیں ہوتے جو محبت کی سرمستیوں میں گزرتے ہیں۔

اسے حامی کے پیار کی ایک ایک ادا یاد آ رہی تھی۔ اس کے لہجے کی مٹھاس' اس کا شرمانا' شرما کر باہوں میں سمٹ آنا' محبت کی گرمی سے اس طرح پگھل جانا جیسے وہ جسم محض صفدر کے لیے ہی تخلیق کیا گیا ہو۔ عورت صرف پیار نہیں دیتی' پیار کی ضمانت بھی دیتی ہے۔ اپنی وفا کا یقین بھی دلاتی ہے اور یقین دلانے کے لیے محبت کی زبان سے وعدے بھی کرتی ہے۔ "جیوں گی تو تمہارے لئے' مروں گی تو تمہارے لئے۔"

اے وعدہ شکن! تم مجھے کیا یاد رکھو گی۔ تمہیں تو اپنا وعدہ بھی یاد نہ رہا۔

صفدر ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ نہ تو حامی سے شکوہ کر سکتا تھا اور نہ ہی اپنے دوست کی خوشیوں کو پامال کر سکتا تھا۔ اب دل کو سمجھانے کے لیے صرف ایک ہی بات رہ گئی تھی کہ چلو وہ بے وفا سہی' مگر ایک دوست کے دل کا قرار تو بن گئی ہے۔

کمال کے آنے سے اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے ایک چھوٹا سا چمڑے کا بیگ اسے دے کر کہا۔

"یہ لو اپنے پندرہ ہزار اور خرید کر لے آؤ اپنی بلبل کو۔ ذرا ہم بھی اس کا چہکنا دیکھیں!"

وہ کار اسٹارٹ کر کے ڈرائیو کرتا ہوا کوٹھی کے احاطہ سے باہر آیا۔

"اب بتاؤ تمہیں کہاں ڈراپ کروں؟"

"لبرٹی کے قریب!" صفدر نے کہا۔ "میں وہاں سے ٹیکسی میں چلا جاؤں گا۔"

"بھئی تم خواہ مخواہ تکلف کر رہے ہو۔ کہو تو میں تمہیں رحمان پورہ چھوڑ دوں۔"

"بیکار وقت ضائع نہ کرو۔ تمہیں دوائیں لے کر فوراً ہسپتال پہنچنا ہے۔"

"ہاں' یہ بھی ٹھیک ہے۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "تمہیں رحمان پورہ کی گلی عزیز ہے اور مجھے ہسپتال کا ایک کمرہ اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ یار! یہ محبت بھی عجیب چیز ہے۔ پہلے میں کسی کے دروازے پر جھانکنے بھی نہیں جاتا تھا۔ آج ہسپتال کے دروازے کی طرف کھنچا جا رہا ہوں۔"

صفدر نے ایک اداس مسکراہٹ سے کہا۔

"شکر کرو کہ محبت تمہیں ہسپتال کے دروازے تک بلا رہی ہے۔ بہت سے لوگوں کو تو قبرستان کے دروازے تک کھینچ کر لے جاتی ہے۔"

"اے خبردار! بدشگونی کی باتیں نہ کرنا۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میری محبت ناکام ہو جائے؟"

صفدر نے دل ہی دل میں کہا۔

"اگر میں چاہتا تو اب تک تمہاری محبت کے سامنے دیوار بن جاتا۔ اب تک تمہاری محبت ناکام ہو چکی ہوتی۔"

پھر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا۔

"نہیں کمال! تمہاری خوشی میری خوشی ہے۔ تمہاری محبت' میری محبت ہے۔ میری دعا ہے کہ یہ محبت ہمیشہ خوشگوار ماحول میں پروان چڑھے۔ مگر میری جان! انسان کی سوچی ہوئی تمام باتیں پوری نہیں ہو جاتیں۔ سفر کے دوران صرف ٹھنڈی چھاؤں نہیں ملتی۔ کڑی دھوپ بھی آتی ہے' منزل تک پہنچنا ہر مسافر کے مقدر میں نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ منزل سے بھٹک بھی جاتے ہیں۔"

"یار' کہاں کا فلسفہ لے کر بیٹھ گئے ہو' چلو اترو۔ وہ سامنے ٹیکسی اسٹینڈ سے تمہیں ٹیکسی مل جائے گی۔ بات دراصل یہ ہے صفدر کہ تم غریبی کی وجہ سے ہمیشہ ایک ناکام زندگی سے الجھتے رہے ہو۔ اس لئے ناکامی کی باتیں کرتے ہو لیکن میرے پاس تو دولت

ہے اور جہاں دولت ہو وہاں ناکامی کا گزر نہیں ہوتا۔"

صفدر مسکراتا ہوا کار سے اتر گیا اور دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔

"اچھا میرے شہزادے! خدا حافظ!"

"خدا حافظ!" کمال ڈرائیو کرتا ہوا اس سے دور ہوتا چلا گیا۔

صفدر کے ہاتھ میں چمڑے کا ایک چھوٹا سا بیگ رہ گیا۔ اس بیگ میں پندرہ ہزار تھے۔ کمال نے ابھی کہا تھا کہ جہاں دولت ہو' وہاں ناکامی کا گزر نہیں ہوتا۔ صفدر کے بیگ میں بھی اتنی دولت تھی کہ وہ حامی کو خرید سکتا تھا لیکن اب خریدنے کا وقت گزر چکا تھا۔ دولت ہونے کے باوجود وہ ناکام تھا۔

اب اسے فیصلہ کرنا تھا کہ وہ کمال اور اس کی والدہ سے کیا بہانہ کرے؟ ان سے کس طرح کہے کہ جس لڑکی کو وہ خریدنا چاہتا تھا' اس کی بولی بہت اونچی چلی گئی تھی۔ اس لئے ایک دولتمند اسے لے کر چلا گیا اور لڑکی کا کیا ہے' وہ محبت کو نہیں دیکھتی۔ دام دینے والے ہاتھوں کو تھام کر چلی جاتی ہے۔ وہ زبان سے کئے ہوئے وعدے کو نہیں بلکہ زبان سے نکلی ہوئی نیلام کی اونچی سے اونچی بولیوں کو یاد رکھتی ہے۔

صفدر شکست خوردہ انداز میں ایک طرف چل پڑا۔

☆------------☆------------☆

حامی ہسپتال کے ایک ائر کنڈیشنڈ کمرے میں' ایک آرام دہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ قریب ہی دو کرسیوں پر ماموں اور ممانی بیٹھے ہوئے آپس میں ہولے ہولے گفتگو کر رہے تھے۔ ان کے سامنے تیسری کرسی خالی تھی۔ زبیدہ خاتون ابھی ابھی وہاں سے اٹھ کر ڈاکٹر سے یہ پوچھنے گئی تھیں کہ خون کی بوتلیں حاصل ہو سکی ہیں یا نہیں؟

حامی جاگ رہی تھی اور خاموشی سے لیٹی ہوئی کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے ظاہر ہونے والی الجھنوں سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ اپنے ہی متعلق سوچ رہی ہے کہ...... وہ کون ہے؟ اسے یاد کیوں نہیں آتا کہ کل تک اس کی زندگی کیا تھی اور کیسی تھی؟

کیا اس کی زندگی کی ابتداء آج ہی سے ہوئی ہے؟

یہ جو بزرگ اس کے قریب بیٹھے ہیں' اس کے ماں باپ ہیں۔ خود انہوں نے ہی کہا تھا کہ وہ اس کے والدین ہیں۔ یہ کیسی عجیب سی بات ہے کہ وہ اپنے والدین کو بھی نہیں پہچان سکی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ غسل خانہ میں پھسل کر گرنے کی وجہ سے اس کے سر سے بہت سارا خون بہہ چکا ہے اور اس کا دماغ اتنا کمزور ہو چکا ہے کہ اب اسے اپنے زندگی کے متعلق زیادہ سوچنا اور غور کرنا نہیں چاہئے۔

اس بات کی انہوں نے سختی سے تاکید کر دی تھی کہ دوسروں کے سامنے وہ اپنے متعلق کوئی سوال نہ کرے کہ وہ کون ہے؟ اور اپنے متعلق کوئی بات اسے یاد کیوں نہیں آتی ہے؟ اگر وہ ایسے سوالات کرے گی تو لوگ اسے پاگل سمجھیں گے۔

ٹھیک ہے تو ہے۔ کوئی اپنے ہی بارے میں ایسے بے تکے سوالات کرے کہ میں کون ہوں؟ اور کہاں سے آئی ہوں؟ تو لوگ یقیناً اسے پاگل کہیں گے۔

اس کے والدین نے خاص طور سے یہ ہدایت بھی کی تھی کہ وہ اس معزز اور مہربان خاتون کے سامنے (کیا نام ہے ان کا؟ ہاں.... زبیدہ خاتون!" (زبیدہ خاتون کے سامنے اس طرح پاگلوں جیسی باتیں نہ کرے۔ کیونکہ...... کیونکہ وہ اس کی ہونے والی ساس ہیں۔

ساس کا خیال آتے ہی حامی کے تصور میں دو نوجوانوں کا سراپا ابھر آیا۔ وہ دونوں اس کی چارپائی کے قریب کھڑے ہو۔ئے تھے۔ اسے اسٹریچر پر ڈالنے کے لیے اس کے قریب آنا چاہتے تھے' اسے چھونا چاہتے تھے' اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر اٹھانا چاہتے تھے' پھر ایک نوجوان نے اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں اٹھالیا۔

ہائے! مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے وہ پہلے بھی اسی طرح مجھے اپنے بازوؤں میں اٹھا چکا ہے۔ اسے میں نے دیکھا ہے' کہیں ضرور دیکھا ہے۔ مگر یاد نہیں آتا کہ کہاں دیکھا ہے۔

اللہ! یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ جب وہ مجھے دیکھ رہا تھا تو مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں اس کی نگاہوں کو اور اس کے دیکھنے کے انداز کو پہچانتی ہوں لیکن یہ کیسی پہچان ہے کہ میں اس کی آنکھوں کو پہچانتی ہوں اور اسے نہیں پہچانتی۔

مگر وہ ہے کون؟

کیا اس مہربان خاتون کا لڑکا ہے؟

کیا میرا رشتہ اسی سے طے ہوا ہے؟

حامی سوچتے سوچتے الجھن میں پڑ گئی۔ پھر وہ کروٹ بدل کر اپنے والدین کی جانب دیکھنے لگی۔ ماموں اسے کروٹ بدلتے دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔

"کیا بات ہے بیٹا! بھوک لگی ہے؟"

"نہیں۔"

"واہ..... نہیں کیسے!" ممانی اٹھ کر میز کے قریب آئیں۔ "یہ دیکھو تمہارے لئے پھلوں کا رس تیار ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ زیادہ سے زیادہ کھاؤ پیو اور کسی بات کی فکر نہ کرو۔ اللہ نے چاہا تو جلد ہی صحت یاب ہو جاؤ گی۔"

وہ پھلوں کے رس سے بھرا ہوا پیالہ اور ایک چمچہ اٹھا کر اس کے قریب آ گئیں۔

ماموں نے اسے ذرا سا اٹھا کر اس کی پشت پر تکیئے کا سہارا دے دیا اور ممانی اسے ایک ایک چمچہ رس پلانے لگیں۔

پھر انہوں نے اسے تشویش سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم خاموشی سے لیٹی ہوئی الٹی سیدھی باتیں تو نہیں سوچتیں؟"

"آں!" اس نے پریشان ہو کر کہا۔ "میں تو کوشش کرتی ہوں امی کہ کچھ نہ سوچوں۔ مگر کوئی نہ کوئی بات ایسی ہوتی ہے کہ میں سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہوں۔"

ممانی نے اسے گہری نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔

"تو تم ابھی کسی بات پر غور کر رہی تھیں؟"

"جی ہاں!"

ماموں نے بڑی شفقت سے کہا۔

"بیٹا! تم اس طرح نہ سوچا کرو۔ کوئی الجھن ہو تو ہمیں بتا دیا کرو۔ ہم اسے سلجھائیں گے۔"

ممانی نے بھی حوصلہ دیا۔

"ہاں' ہاں۔ ہمیں بتاؤ! بیٹا ہم تمہاری الجھنوں کو دور کریں گے۔ تم کیا سوچ رہی تھیں؟"

حامی ہچکچاتی ہوئی کہنے لگی۔

"جی...... وہ...... جب سے میں نے اسے دیکھا ہے۔ مجھے' مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں پہلے بھی اسے دیکھ چکی ہوں۔"

"کسے دیکھ چکی ہو...... کسے دیکھا ہے تم نے؟" ممانی نے پوچھا۔

"جی وہی...... وہ...... جس نے مجھے چارپائی سے اٹھایا تھا۔"

ممانی اور ماموں چونک کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

حامی نے الجھے ہوئے ذہن سے پوچھا۔

"امی...... وہ...... وہ کون ہے؟ مجھے تو کچھ یاد نہیں آتا....."

ممانی نے جواب دیا۔

"یاد کیسے آئے گا؟ یاد آنے والی بات ہو تو یاد آئے۔ وہ تو آج ہی زبیدہ خاتون کے

ساتھ ہمارے گھر آیا تھا۔ ہم نے بھی پہلی بار اسے دیکھا ہے۔ پھر تم اسے کہاں سے دیکھ لیتیں؟"

"میں سمجھ گیا!" ماموں نے مسکرا کر کہا۔ "دراصل حامی نے کبھی خواب میں اس نوجوان سے ملتا جلتا چہرہ دیکھا ہوگا۔ اسی لئے اب اس نوجوان کو دیکھ کر سوچ رہی ہے کہ یہ پہلے بھی اس سے مل چکی ہے۔ پگلی کہیں کی....."

انہوں نے پیار سے اس کا سر سہلاتے ہوئے کہا۔

"اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ تم زیادہ نہ سوچا کرو۔ اچھا ہی ہوا کہ تم نے یہ بات زبیدہ خاتون کے سامنے نہیں کہی۔ ورنہ وہ برا مان جاتیں۔ آخر کو وہ تمہاری ہونے والی ساس ہیں۔ وہ یہ کیسے برداشت کر سکتی ہیں کہ تم ان کے بیٹے کے متعلق سوچنے کی بجائے کسی غیر کے متعلق سوچو۔"

"ہاں بیٹا!" ممانی نے کہا۔ "وہ جو دوسرا نوجوان تمہاری چارپائی کے پاس کھڑا تھا نا؟ وہی زبیدہ خاتون کا لڑکا ہے' اس کا نام کمال احمد ہے۔ اسی سے تمہارا رشتہ طے پایا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے انہوں نے حامی کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ تاکہ اس رشتہ کے متعلق اس کی پسند اور ناپسند کا پتہ چل جائے لیکن چہرہ سپاٹ تھا اور ہر قسم کے تاثرات سے عاری ہے۔

وہ صفدر کو کس طرح پسند کرتی اور کمال کو کس وجہ سے ناپسند کرتی؟ دونوں ہی تو اس کے لیے اجنبی تھے۔ کسی سے کوئی دلی یا ذہنی لگاؤ نہیں تھا۔ ہاں' صفدر ایک واہمہ کی طرح اس کے ذہن کو کبھی کبھی چھوتا تھا اور ایک سائے کی طرح گزر جاتا تھا۔ ایسے میں وہ اس کے متعلق سوچ سکتی تھی۔ سوچنے کے بعد پسند کرنے کا مرحلہ بہت دیر میں طے ہوتا ہے اور اس مرحلہ کو طے کرنے سے پہلے ہی ممانی نے اس کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ کمال اس کا منگیتر ہے۔

کمال کی شخصیت بھی اتنی خوبصورت تھی کہ حامی اسے ناپسندیدگی سے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ کمال اور صفدر..... صفدر اور کمال...... دونوں ہی فی الحال ایک جیسے تھے۔ اگر صفدر' کمال سے پہلے ہی اس کے بہت قریب آگیا تھا۔ اپنے بازوؤں میں اٹھا کر اسے اپنے متعلق سوچنے پر مجبور کر چکا تھا۔ تو کمال کا رشتہ بھی کمزور نہیں تھا۔ وہ ایک منگیتر اور ایک

ہونے والے شریک حیات کی حیثیت سے اپنی اہمیت کا احساس دلا رہا تھا۔

کمال سے اپنے رشتے کی بات سن کر وہ اس کے چہرے کو یاد کرنے لگی۔ یاد اس لئے کرنے لگی کہ اس نے توجہ سے اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ بس ایک نظر ڈالی تھی' اس کے بعد صفدر کی نظروں نے اسے الجھا لیا تھا۔ وہ نظریں اسے کچھ یاد دلانے کی کوششیں کر رہی تھیں۔ اس سے کہہ رہی تھیں کہ مجھے پہچانو! لیکن اس کی امی اور اس کے ابا کہہ رہے تھے کہ اس سے کبھی کی پہچان نہیں تھی' اس لئے اسے کس طرح پہچانا جا سکتا ہے؟

"کیا سوچ رہی ہو؟" ماموں نے پوچھا۔ "کچھ ہمیں بھی بتاؤ۔"

ممانی جلدی سے بولیں۔

"ارے آپ بھی حد کرتے ہیں۔ لڑکیاں اپنی شادی کی بات سننے کے بعد بھلا منہ سے کچھ کہتی ہیں۔ یہ تو بیماری سے چپ ہے۔"

وہ اس کی بلائیں لینے لگیں۔

اسی وقت کمال کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں بہت سارے پیکٹس تھے۔ انہیں دیکھ کر پتہ چلتا تھا کہ وہ بڑی زبردست قسم کی شاپنگ کر کے آ رہا ہے۔

ماموں نے مسکرا کر کہا۔

"بھئی' یہ سب کیا اٹھا لائے ہو؟"

"کچھ نہیں انکل! ضرورت کی چیزیں ہیں۔ صابن' تیل' کنگھی' تولیہ۔ اس پیکٹ میں دوائیں ہیں۔ اس تھیلے میں کچھ تازہ پھل ہیں۔ اور...... اور...... اور تو مجھے بھی یاد نہیں ہے کہ میں کیا کچھ اٹھا لایا ہوں۔"

وہ ایک میز پر تمام چیزیں رکھنے لگا۔ ممانی نے کہا۔

"بیٹا' ہماری وجہ سے تم لوگوں کو بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑ رہی ہیں۔"

کمال نے مسکرا کر کہا۔

"دیکھئے آنٹی! آپ غیروں کی طرح باتیں نہ کریں۔ کیا آپ ہمیں غیر سمجھتی ہیں؟"

"اے خدا نہ کرے کہ میں تمہیں غیر سمجھوں۔" انہوں نے بلائیں لے کر کہا۔

"میں تو تمہیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز سمجھتی ہوں۔"

کمال نے مسکرا کر کہا۔

"بس تو پھر کبھی غیروں کی طرح تکلف نہ کیجئے گا۔ ورنہ ہمیں صدمہ پہنچے گا۔"

پھر وہ دوا کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"اب آپ ایک خوراک دوا انہیں پلا دیں۔ دوا جتنی پابندی سے پی جائے گی۔ اتنی ہی جلدی آرام آئے گا۔"

"بیٹا! میں تو تمہاری امی کے پاس جا رہی ہوں۔ کون سی دوا کس وقت پلانی ہے' یہ ہم سے زیادہ تم جانتے ہو۔ تم ہی پلاؤ' میں ابھی آتی ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے وہ دروازے کی طرف گئیں پھر وہاں رک کر انہوں نے ماموں کو گھور کر دیکھا اور کہا۔

"آپ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہیں۔ ذرا مجھے وہاں تک چھوڑ آیئے۔ ہسپتال میں اکیلے گھومتے ہوئے مجھے وحشت سی ہوتی ہے۔"

"ہاں' ہاں چلو۔" ماموں اپنی بیگم کا مقصد سمجھ گئے کہ وہ لڑکے اور لڑکی کو تنہا چھوڑنا چاہتی ہیں۔

وہ دونوں کمرے سے باہر چلے گئے۔

کمال نے مسکرا کر حامی کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی اور اس کی موجودگی سے ہچکچا رہی تھی۔

کمال نے پھلوں کے رس کا پیالہ اٹھا کر کہا۔

"آپ رس پی رہی تھیں۔ پہلے اسے ختم کر لیجئے۔ پھر دوا کی باری آئے گی۔"

"جی!" وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ "میں پی چکی ہوں۔ اب مجھے بھوک نہیں ہے۔"

کمال نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ پھلوں کا یہ رس پینے سے بھلا کہیں بھوک مٹتی ہے۔ یہ تو محض جسم میں خون اور توانائی بڑھانے کے لیے پیا جاتا ہے۔"

وہ رس کا پیالہ اس کے قریب لے آیا اور ایک چمچہ رس اٹھا کر بولا۔

"چلئے' منہ کھولئے۔"

وہ شرمانے اور جھجکنے لگی۔

کمال دم بخود ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ شرماتے ہوئے اور زیادہ حسین نظر آ رہی تھی۔ حسن معصوم آہستہ آہستہ اس طرح اس کے دل میں اتر رہا تھا جیسے پھلوں کا میٹھا اور مصفا رس دھیرے دھیرے دل تک پہنچتا ہے اور ایک نئی توانائی بخشتا ہے۔ کمال کو بھی ایک نئی توانائی اور ایک نئی امنگوں بھری زندگی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے بڑی محبت سے پوچھا۔

"کیا میں اس قابل نہیں ہوں کہ آپ کو اپنے ہاتھوں سے پلا سکوں؟"

حامی اس سوال پر گھبرا گئی۔ وہ اس کا محسن تھا' اس کا منگیتر تھا۔ اس کے ہاتھوں سے تو وہ زہر کا جام بھی پی سکتی تھی۔ پھر آب حیات پینے سے کس طرح انکار کر سکتی تھی۔ اس نے ہولے سے آنکھیں بند کیں اور رس بھرے لبوں کو رس بھرے جام کے لئے کھول دیا۔

کمال مسرت سے کھل گیا۔ وہ چمچے کو اس کے لبوں کے درمیان لے جا کر رس پلانے لگا۔

پھر اس کا ہاتھ لرزنے لگا۔

پھول کی پتیوں جیسے نازک لبوں کو حالانکہ اسٹیل کا ایک چمچہ چھو رہا تھا مگر کمال کے جسم کی ساری کائنات تھرتھرا رہی تھی۔

☆------------☆------------☆

زبیدہ خاتون اور کمال ہسپتال سے اپنی کوٹھی میں واپس آئے تو رات ہو چکی تھی۔ کمال کا منیجر ڈرائنگ روم میں بیٹھا ان کا انتظار کر رہا تھا۔ کمال نے گھر پہنچتے ہی ملازموں سے صفدر کے متعلق دریافت کیا۔ اسے یہ سن کر مایوسی ہوئی کہ صفدر ابھی تک واپس نہیں آیا ہے۔ آج وہ صفدر سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنی اور حامی کی ملاقات اور اسے پھلوں کا رس پلانے کا دلچسپ واقعہ سنانا چاہتا تھا۔ ایک صفدر ہی تو تھا جس سے وہ اپنے دل کی باتیں کہہ سکتا تھا مگر وہ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔

منیجر نے زبیدہ بیگم کو بینک کی ایک سلپ دیتے ہوئے کہا۔

"یہ پچاس ہزار میں نے بینک میں جمع کرا دیئے ہیں اور یہ اخراجات کا حساب ہے۔"

زبیدہ خاتون نے کاغذات لیتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے میں حساب چیک کرلوں گی۔ ابھی تو بہت تھکی ہوئی ہوں۔"

پھر وہ دیوار گھڑی کی طرف دیکھتی ہوئی بولیں۔

"گیارہ بج گئے۔ آخر یہ صفدر کہاں چلا گیا ہے۔"

"بالکل گدھا ہے۔" کمال نے جھنجلا کر کہا۔ "کہیں جاتا ہے تو فون پر بھی اطلاع نہیں دیتا۔"

منیجر نے مسکرا کر کہا۔

"پریشان ہونے کی بات نہیں ہے۔ وہ بچے تو نہیں ہیں کہ کہیں گم ہو جائیں

گے۔"

زبیدہ خاتون نے جواب دیا۔

"مصیبتیں کبھی پوچھ کر نہیں آتیں۔ وہ پندرہ ہزار روپے لے کر گیا ہے۔ کسی چور اچکے کی نظر پڑ گئی تو اس کی جان کا دشمن بن جائے گا۔"

"پندرہ ہزار۔" منیجر نے حیرت سے پوچھا۔ "وہ اتنی بڑی رقم لے کر کہاں گئے ہیں؟"

زبیدہ خاتون اور کمال نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ کسی سے یہ نہیں کہنا چاہتی تھیں کہ وہ پندرہ ہزار میں ایک بہو خرید رہی تھیں۔ انہوں نے بات بنا کر کہا۔

"میں نے بیگم وقار علی کے پاس بھیجا ہے۔ انہوں نے قرض مانگا تھا۔"

منیجر کچھ سوچنے لگا۔ پھر اس نے بڑے ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بیگم صاحبہ میں بیس برس سے آپ کا نمک کھا رہا ہوں۔ اس گھر کے اہم معاملات میں آپ نے میرے مشوروں کو بھی قبول کیا ہے۔ پندرہ ہزار کے سلسلے میں' میں اتنا ضرور کہوں گا کہ جب اتنی بڑی رقم دینا ہی تھی تو انہیں ایک چیک بھجوایا جا سکتا تھا۔"

کمال نے اسے ناگواری سے کہا۔

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ یہی کہ پندرہ ہزار کے لیے صفدر کی نیت خراب ہو سکتی ہے؟"

منیجر نے جواب دیا۔

"میں جانتا ہوں کہ صفدر صاحب آپ کے گہرے دوست ہیں۔ اتنے گہرے دوست کہ بیگم صاحبہ انہیں اپنے بیٹے کی طرح پیار کرتی ہیں مگر زندگی کے تلخ تجربات کبھی کبھی گہرے اعتماد کو ٹھیس پہنچا دیتے ہیں۔ دولت جتنی اچھی ہے اتنی ہی بری بھی ہے۔ اتنی بری کہ باپ اور بیٹے کے رشتے کو بھی کاٹ دیتی ہے۔"

"جی ہاں' یہ آپ کا تلخ تجربہ ہے۔" کمال نے تلخی سے کہا۔ "کیونکہ آپ کا بیٹا جوئے اور شراب کا عادی ہے اور آپ کی محبت سے فائدہ اٹھا کر آپ کی کمائی کو ہمیشہ عیاشی میں برباد کرتا رہتا ہے۔"

منیجر دکھی نظروں سے اسے تکنے لگا۔ زبیدہ خاتون نے کمال سے کہا۔

"بیٹا' تمہیں منیجر صاحب سے ایسی باتیں نہیں کرنا چاہئیں۔ ان کا بیٹا آوارہ سہی لیکن یہ تو ایماندار ہیں۔ انہوں نے ہمیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔"

منیجر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"میرے لڑکے نے مجھے اس قابل نہیں رکھا کہ میں سر اٹھا کر بات کر سکوں۔ مگر میری دعا ہے کہ ایک دوست کی وجہ سے آپ کو کبھی سر نہ جھکانا پڑے۔"

وہ سر جھکا کر جانے لگا تو زبیدہ خاتون نے چابیوں کے گچھے سے ایک چابی نکال کر دیتے ہوئے کہا۔

"منیجر صاحب! انیکسی کی چابی لیتے جائیے۔ کسی ملازم سے کہہ دیجئے کہ کمروں کی صفائی کر دے۔ جب تک آپ ہمارے ساتھ روٹی کھالیں۔"

"بڑی مہربانی ہے بیگم صاحبہ! میں روٹی کھا کر آیا ہوں۔ کل صبح ناشتہ میں شریک ہو جاؤں گا۔"

وہ انیکسی کی چابی لے کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ سوچ میں پڑ گئیں۔ کمال نے پوچھا۔

"آپ کیا سوچ رہی ہیں؟"

"آں!" انہوں نے چونک کر کہا۔ "کچھ نہیں' بس یونہی سوچ رہی ہوں کہ صفدر ابھی تک واپس کیوں نہیں آیا ہے؟"

کمال نے انہیں گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کا کیا خیال ہے؟ وہ کہاں جا سکتا ہے؟"

"آں' تم مجھے غلط نہ سمجھو بیٹے۔ میں اس پر کبھی شبہ نہیں کر سکتی۔ میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ جہاں وہ رقم لے کر گیا ہے وہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔ اپنی بھانجی کا سودا کرنے والے اتنی بڑی رقم دیکھ کر ہیرا پھیری بھی کر سکتے ہیں۔ ہم سے بڑی غلطی ہوئی۔ کم از کم تمہیں اس کے ساتھ ضرور جانا چاہئے تھا۔"

"میں کیا کروں امی؟ میں نے کئی بار کہا۔ مگر وہ تنہا جانے پر بضد تھا۔ ایک نمبر کا گدھا ہے۔ آنے دو اسے' میں اس کی اچھی طرح خبر لوں گا۔"

وہ صفدر پر جھنجلانے لگا۔ اسے اس بات کی فکر نہیں تھی کہ صفدر کو کوئی خطرہ

پیش آ سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا دوست موم کا بنا ہوا نہیں ہے۔ اسے تو محض اس بات کا غصہ تھا کہ اپنی محبت کی داستان سنانے کے لیے ایک رازدار دوست سامنے نہیں تھا۔

وہ رات کے کھانے کے دوران بھی اس کا منتظر رہا۔ کھانے کے بعد سونے کے لیے گیا تو بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ حامی کا خوبصورت چہرہ بار بار اس کی نگاہوں کے سامنے آ کر اسے کہہ رہا تھا کہ وہ اس چہرے کی خوبصورت کہانی اپنے دوست کو سنائے۔ مگر سننے والا کا پتہ ہی نہیں تھا۔

دوسری صبح وہ ناشتے کی میز پر آیا تو زبیدہ خاتون اور منیجر اس کا انتظار کر رہے تھے۔

"امی!" اس نے پوچھا۔ "صفدر کی کچھ خبر ملی؟"

"نہیں بیٹے! وہ تو ابھی تک لاپتہ ہے۔ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔"

کمال نے منیجر کی طرف دیکھا۔ منیجر نے مسکرا کر گردن جھکا لی۔ اس کی مسکراہٹ میں طنز تھا۔ کمال نے جھلا کر کہا۔

"میں ابھی جا کر اسے تلاش کرتا ہوں۔"

منیجر نے پوچھا۔

"اتنے بڑے شہر میں آپ کہاں کہاں تلاش کریں گے۔ بہتر ہے کہ آپ تھانہ میں گمشدگی کی رپورٹ لکھوا دیں۔"

"مجھے آپ کے مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔" کمال نے بگڑ کر کہا۔

منیجر نے جواب دیا۔

"آپ ناحق مجھ پر ناراض ہو رہے ہیں۔ میں نے چوری کی رپورٹ لکھوانے کے لیے نہیں بلکہ گمشدگی کی رپورٹ لکھوانے کی درخواست کی تھی۔"

اسی وقت ایک ملازم کچن سے انڈوں اور پراٹھوں کی پلیٹیں لے کر آیا اور سب کے سامنے رکھتے ہوئے زبیدہ خاتون سے بولا۔

"بیگم صاحبہ! صفدر صاحب کو جا کر جگا دوں؟"

زبیدہ خاتون نے جھلا کر کہا۔

"وہ یہاں آیا کب ہے کہ تم جگا دو گے؟"

"جی!" ملازم نے حیرت سے کہا۔ "وہ تو رات کو آئے تھے۔"

"رات کو آیا تھا؟" کمال نے چونک کر پوچھا۔

"جی صاحب! میں نے خود رات کو دروازہ کھولا ہے۔"

کمال اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"نان سنس! ہم بھی عجیب ہیں۔ ہمیں اس کے کمرے میں جھانک کر تو دیکھ لینا چاہئے تھا کہ وہ رات کو آیا ہے یا نہیں۔"

وہ صفدر کے کمرے کی طرف جانے لگا۔ زبیدہ خاتون بھی اٹھ گئیں۔ پھر منیجر کس طرح بیٹھا رہ سکتا تھا۔ وہ بھی ان کے پیچھے چل پڑا۔

صفدر اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ کمال تو یہی سوچ کر آیا تھا کہ اسے نیند سے جھنجھوڑ ڈالے گا مگر قریب پہنچ کر وہ ٹھٹک گیا۔ صفدر کی بند آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ تکیئے کا کچھ حصہ بھی بھیگا ہوا نظر آ رہا تھا۔ زبیدہ خاتون کے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ کیا یہ یتیم بچہ نیند میں رو رہا ہے؟ کیا ہو گیا ہے اسے؟

منیجر بھی دم بخود کھڑا ہوا اسے تک رہا تھا۔ زبیدہ خاتون آہستہ آہستہ آگے بڑھیں اور بڑی شفقت سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔

صفدر کی آنکھ کھل گئی۔ پھر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور جلدی سے آنسو پونچھنے لگا۔

"تم رو رہے ہو؟" زبیدہ خاتون نے حیرت سے پوچھا۔

"جی..... جی نہیں تو..... میری آنکھوں میں تکلیف ہے۔ سوتے وقت اکثر اسی طرح آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔"

کمال نے اس کے بازو کو مضبوطی سے جکڑ کر کہا۔

"ہمیں بیوقوف بنانے کی کوشش نہ کرو۔ سچ سچ بتاؤ' بات کیا ہے؟"

صفدر نے جبراً مسکراتے ہوئے کہا۔

"بات کچھ بھی نہیں ہے۔ میں رقم لے کر پہنچا تو کارواں جا چکا تھا۔ اب وہاں کوئی نہیں ہے؟"

"کیا کہہ رہے ہو؟ کیا..... کیا..... تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ وہ لڑکی کو کہیں دوسری جگہ لے گئے ہیں؟"

"ہاں یہی سمجھو۔ یا تو وہ لڑکی کو لے گئے ہیں یا پھر لڑکی نے ہی اپنا راستہ بدل دیا

ہو گا۔"

زبیدہ خاتون نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"مگر تمہیں تو لڑکی پر بڑا اعتماد تھا۔ پھر تم کیسے کہتے ہو کہ اس نے ارادہ بدل دیا ہو گا۔"

صفدر نے نظریں چرا کر کہا۔

"وقت کے ساتھ بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ چھوٹے سے سفر کا اعتماد تھا' چھوٹا ہی ثابت ہوا۔"

"میں نہیں مانتا۔" کمال نے کہا۔ "کل تم اس کی وفاداری کی قسمیں کھا رہے تھے اور آج اسی کے نہ ملنے پر اسے برا کہہ رہے ہو۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس کے سرپرستوں نے اس بے چاری کو پھر مجبور کر دیا ہو؟"

"مجبور!" صفدر نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ "ہاں مجبوری کئی طرح کی ہوتی ہے۔ کبھی لڑکیوں کو ان کے سرپرست مجبور کر دیتے ہیں اور کبھی دولت کی چمک دمک دیکھ کر وہ مجبور ہو جاتی ہیں۔ مجبوری کی حقیقت کو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔"

"لعنت ہے ایسے لوگوں پر۔" زبیدہ خاتون نے کہا۔ "زبان دے کر مکر جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے انہیں تم پر بھروسہ نہیں تھا کہ اتنی بڑی رقم لا سکو گے۔ اسی لئے انہوں نے کہیں اور سودا کر لیا۔ آخر بازاری جو ٹھہرے۔ توبہ ہے ایک بیٹے کے لئے خوشیاں آئی ہیں اور دوسرے بیٹے کے لیے ماتم......"

صفدر نے جلدی سے کہا۔

"آپ ایسا نہ کہیں۔ کمال کی خوشی میری خوشی ہے۔ اس خوشی میں' میں اپنے سارے غم بھلا دوں گا۔ ٹھہریئے! میں آپ کو دکھاتا ہوں۔ وہ جو آپ نے پندرہ ہزار دیئے تھے نا' وہ ضائع نہیں ہوئے......"

وہ بستر سے اتر کر فرش پر آیا اور پلنگ کے نیچے سے ایک سوٹ کیس نکال کر اسے بستر پر رکھ دیا۔

"یہ کیا ہے؟" زبیدہ خاتون نے پوچھا۔

اس نے سوٹ کیس کھول دیا۔ زیورات کے ڈبوں اور ریشمی ساڑھیوں سے سوٹ

کیس بھرا ہوا تھا۔ وہ ایک ایک ڈبہ کھول کر زیور دکھانے لگا۔

"یہ تم نے خریدا ہے؟" زبیدہ خاتون نے پوچھا۔

"جی ہاں! یہ سب..... یہ سب کمال کی ہونے والی دلہن کے لیے ہیں۔"

زبیدہ خاتون کی آنکھیں فرطِ محبت سے بھیگ گئیں۔ کمال نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"صفدر! تم نے کتنی خوبصورتی سے اپنی ناکامی کا رخ بدل دیا ہے۔"

صفدر نے جواب دیا۔

"دریاؤں کے رخ بدل جائیں تو سیلاب سے رستے بستے گھر تباہ ہو جاتے ہیں اور دوستی اپنا رخ بدلے تو دوست کی خوشی میں اجڑی ہوئی دنیا آباد ہو جاتی ہے۔"

کمال نے اس کے شانے کو تھپک کر کہا۔

"غم نہ کرو دوست! دل کو ہزار بہانوں سے بہلانا ہی پڑتا ہے۔ وہ لڑکی بدنصیب ہے ورنہ یہ کپڑے اور زیورات اس کے نصیب میں ہوتے۔"

صفدر نے شکستہ دلی سے مسکرا کر کہا۔

"جس کے نصیب میں تھے' اس کو مل رہے ہیں۔ نصیب کا چکر ایسے ہی چلتا ہے۔"

منیجر نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ بیگم صاحبہ' آپ نے کہا تھا کہ آپ نے پندرہ ہزار بیگم وقار کے لیے بھیجا تھا مگر....."

زبیدہ خاتون نے ہاتھ اٹھا کر اسے آگے کہنے سے روک دیا۔

"میں نے غلط کہا تھا۔ بات کچھ اور ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میرا صفدر اس طرح دھوکا کھا جائے گا۔ اس نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ نصیب کا چکر ایسے ہی چلتا ہے۔"

پھر انہوں نے صفدر سے کہا۔

"چلو بیٹے' منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کرو۔"

"آپ چلئے۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ باتھ روم کی طرف چلا گیا۔

زبیدہ خاتون اور منیجر کمرے سے باہر جانے لگے۔

کمال خاموش کھڑا ہوا کبھی باتھ روم کی طرف دیکھ رہا تھا اور کبھی کھلے ہوئے سوٹ کیس کی طرف جس میں سونے کے زیورات جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔

یہ زیورات کس کی آرائش کے لیے تھے اور کس کے بدن پر اب سجنے والے تھے۔

کمال نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"حامی!...... سچ ہے...... کہ جس کے نصیب میں تھے' اس کو مل رہے ہیں۔"

اس نے سوٹ کیس کو بند کر دیا۔

☆------------☆------------☆

حامی قدرے صحت یاب ہو گئی تھی۔

ہسپتال کی تین منزلہ چھت پر ایک خوبصورت سا باغیچہ تھا جہاں اس کے فرضی والدین اسے سیر کے لیے لے جاتے تھے۔ آج وہ دونوں اس کی شادی کی تاریخ طے کرنے کے لیے زبیدہ خاتون کے ہاں گئے تھے۔ اس لئے وہ تنہا تھی اور تنہا ہی باغیچے کی طرف چلی آئی تھی۔

وہاں اور بھی کئی مریض تھے جن میں سے کچھ بیٹھے ہوئے تھے اور کچھ اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ حامی وہاں صفدر کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ وہ ابھی تک یہ سمجھ نہ سکی تھی کہ صفدر کو دیکھتے ہی وہ انجانی بھول بھلیوں میں کیوں پھنس جاتی ہے۔

اس کی بیماری کے دوران وہ کئی بار اس کے کمرے میں آیا تھا۔ کبھی زبیدہ خاتون کے ساتھ اور کبھی کمال کے ساتھ لیکن کبھی اس نے کسی سے بات نہیں کی تھی۔ وہ ہمیشہ خاموش رہتا تھا اور چور نظروں سے اسے دیکھتا رہتا تھا۔ حامی نے کئی بار اس کی نگاہوں کی چوری پکڑی تھی اور ہر بار اس کے ذہن میں یہی سوال ابھرا تھا کہ وہ کیوں مجھے اس طرح دیکھتا ہے۔ عجیب سی نظریں ہیں۔ ان نظروں میں شناسائی بھی ہے اور اجنبیت بھی مگر دیکھنے کے انداز میں کوئی سستا پن نہیں ہے۔

حامی نے اکثر یہ محسوس کیا تھا کہ اس اجنبی کی آنکھوں میں ایک ڈھکی چھپی التجا ہے لیکن اس کے ذہن میں اس التجا کی کوئی وضاحت نہیں تھی۔

اس وقت بھی صفدر ٹیرس کی چھوٹی سی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا اور اسے

دیکھ رہا تھا۔

حامی کے دل نے کہا کہ آگے نہ بڑھے۔ جہاں کھڑی ہے' وہاں سے لوٹ جائے۔

"آؤ!" صفدر نے کہا۔

وہ جھجکتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔

"تم مجھے دیکھ کر واپس جانا چاہتی تھیں؟"

"جی...... ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔"

صفدر نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں کئی دنوں سے اس موقع کی تلاش میں تھا کہ تم سے تنہائی میں ملاقات ہو اور میں تمہیں کامیابی پر مبارکباد دوں۔"

"کیسی کامیابی؟"

"یہی کہ تم ایک بہت بڑے گھر کی بہو بننے والی ہو۔"

حامی کی آنکھیں مسکرائیں اور اس نے شرما کر منہ پھیر لیا۔

صفدر کے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ اس نے سوچا تھا کہ حامی اس کے طنز پر نادم ہو جائے گی اور اسے احساس ہو جائے گا کہ اس نے صفدر کا دل توڑا ہے مگر وہ بہو بننے کے ذکر پر مسکرا رہی تھی' شرما رہی تھی۔

"شرمانے کی یہ ادا سمجھ میں نہیں آئی کہ شادی کے نام پر شرما رہی ہو یا میری باتوں سے گھبرا کر منہ پھیر رہی ہو؟"

اس نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

"تمہاری باتیں عجیب ہیں' میں کیا جواب دوں۔ تم جو چاہو سمجھ لو۔"

"میں نے تو یہی سمجھا ہے کہ تم گھبرا رہی ہو۔ مگر یہ گھبرانا کب تک؟ شادی کے بعد جہاں تم بہو بن کر آؤ گی' وہاں ہمیشہ مجھ سے سامنا ہوتا رہے گا۔"

حامی نے سر جھکا کر کہا۔

"تم سمجھداری کی باتیں کرتے ہو مگر اتنا نہیں سمجھتے کہ جب نئے رشتے بنتے ہیں تو لڑکی فطری طور پر شرماتی ہے۔ تم ان کے دوست ہو' ان کے بھائی ہو۔ لہٰذا تم سے باتیں کرتے وقت کیا مجھ پر گھبراہٹ طاری نہیں ہوگی؟"

صفدر اس کے بدلے ہوئے مزاج کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ محض حیران ہو کر اسے دیکھ سکتا تھا۔ مگر اس کی بے وفائی پر اسے برا بھلا نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ ہزار بے وفائی کے باوجود وہ اس کے دوست کی آرزو تھی۔

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"یہ بتاؤ' کمال سے کب وعدہ کر رہی ہو؟"

"کیسا وعدہ؟"

"یہی...... جنم جنم تک ساتھ نبھانے کا وعدہ۔"

وعدہ...... وعدہ...... وعدہ...... حامی کے ذہن میں بھٹکی ہوئی آوازوں کی بازگشت گونجنے لگی۔ اس نے دور تک پھیلی ہوئی پھلواری کو دیکھا۔ تمام پھولوں کے رنگ نگاہوں کے سامنے اس طرح گڈمڈ ہو گئے تھے جیسے اس کے ماضی کی تمام یادیں خلط ملط ہو گئی تھیں۔ اس نے گھبرا کر اوپر آسمان کو دیکھا۔ نیلے آسمان پر سفید بادل ٹکڑے ٹکڑے وعدوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔

یک بیک اس کا سر چکرانے لگا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا اور کھڑے ہی کھڑے اس طرح ڈگمگانے لگی جیسے اب تب میں گرنے ہی والی ہو لیکن اس کے گرنے سے پہلے ہی صفدر نے اسے تھام لیا۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

"مم...... میرا سر چکرا رہا ہے۔"

اسی وقت کمال وہاں آن پہنچا۔ آس پاس کے لوگ بھی ان کے قریب پہنچ رہے تھے۔

"کیا بات ہے؟" کمال نے گھبرا کر پوچھا۔

صفدر نے جواباً کہا۔

"انہیں سنبھالو۔ چکر آ رہے ہیں۔"

کمال نے اسے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور کہا۔

"تمہیں ایسی حالت میں یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ آؤ کمرے میں چلو۔"

وہ اسے سہارا دے کر لے جانے لگا۔

صفدر کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔ کمال نے ایک ہاتھ سے حامی کے ہاتھ کو تھام رکھا تھا۔ اس کا دوسرا ہاتھ اس کی کمر کے گرد تھا اور وہ اس سے لگی ہوئی جا رہی تھی۔ تھوڑی دور جا کر کمال نے پلٹ کر اسے دیکھا اور کہا۔

"تم وہاں کیوں کھڑے ہو' آؤ!"

حامی نے بھی سر گھما کر اسے دیکھا۔ دو کالی کالی روشن آنکھیں صفدر کے دل کو رلا گئیں۔ وہ جبراً مسکرایا اور ہاتھ ہلا کر کمال سے بولا۔

"تم جاؤ۔ وش یو گڈ لک!"

کمال نے مسکرا کر حامی کو دیکھا پھر وہ جیتے جاگتے شاہکار مجسمے کو صفدر سے دور لے جانے لگا۔

☆

زبیدہ خاتون نے مسکرا کر ماموں اور ممانی کی طرف دیکھا اور کہا۔

"میں تو آپ لوگوں کی بھلائی کے لیے کہتی ہوں۔ لڑکی کا بوجھ جتنی جلدی سر سے اتر جائے' اتنا ہی اچھا ہے۔ آپ زیادہ نہ سوچیں۔ بس اسی مہینہ کی کوئی تاریخ مقرر کر دیں۔"

ماموں اور ممانی نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا پھر ممانی نے کہا۔

"بہن' اب تک آپ نے ہمارے لئے جو کچھ بھی کیا ہے' ہماری بھلائی کے لیے کیا ہے۔ ہم آپ کی بات سے انکار نہیں کر سکتے لیکن......"

وہ کہتے ہوئے ہچکچانے لگی۔ زبیدہ خاتون نے کہا۔

"ہاں ہاں کہئے۔ آپ رک کیوں گئیں؟"

ماموں نے کہا۔

"وہ بات دراصل یہ ہے کہ ہم نے یہ نہیں سوچا تھا کہ آپ شادی کے سلسلے میں جلدی کریں گی۔ اگرچہ بیٹی کو جلد از جلد بیاہ دینا ہی دانش مندی ہے مگر اسے ڈولی میں بٹھانے سے پہلے ہمارے سامنے ایک بہت بڑی الجھن ہے جسے دور کرنا ضروری ہے۔"

"کیسی الجھن؟"

ممانی نے جواب دیا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ حامی کا ایک چچا زاد بھائی ہے۔ اس سے بچپن ہی میں حامی کی منگنی ہو گئی تھی۔ مگر اب ہمیں پتہ چلا ہے کہ وہ ایک نمبر کا شرابی اور جواری بن گیا ہے۔ اب آپ ہی بتائیں کہ میں جان بوجھ کر اپنی بیٹی کو کنوئیں میں کس طرح گرا سکتی ہوں؟"

"اے لعنت بھیجئے اس رشتے پر!" زبیدہ خاتون نے کہا۔ "بچپن کی منگنی توڑی بھی جا سکتی ہے۔"

ممانی نے کہا۔

"جی ہاں توڑی بھی جا سکتی ہے۔ میں تو خود بھی یہی چاہتی ہوں مگر کیا بتاؤں ہم ان کے احسانات تلے دبے ہوئے ہیں۔"

ممانی نے ماموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"لڑکے کا باپ ان کا بھائی ہے۔ انہوں نے بھائی سمجھ کر دس برس پہلے ان سے تیس ہزار روپے قرض لئے تھے تاکہ زمین خرید کر کھیتی باڑی کا کام کریں۔ ہم نے زمینیں خریدیں۔ دس برس تک پُرسکون زندگی گزاری۔ اسی دوران ہمیں پتہ چلا کہ لڑکا آوارہ اور بدمعاش ہے۔ اس دن میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ان کے بھائی کی رقم لوٹا کر منگنی توڑ دوں گی۔ رقم لوٹانے کے لیے ہم نے زمین جائیداد کو بیچنے کا بھی فیصلہ کر لیا تھا۔ ہم اپنی بیٹی کی خوشی کے لئے خود کو تباہ کر سکتے ہیں مگر یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتے کہ وہ کسی بدمعاش کے گھر رہے لیکن افسوس! اس سیلاب میں سال بھر کی فصل' روپے' کپڑے اور زیورات سب ہی بہہ گئے۔ سیلاب کے بعد صرف زمین رہ جائے گی مگر اس زمین سے تیس ہزار روپے کا قرض ادا کرنا ناممکن ہے۔"

ممانی نے یہ کہتے ہوئے اپنی آنکھوں پر دوپٹے کا آنچل رکھ لیا اور روتے ہوئے کہنے لگیں۔

"میری بچی کتنی بدنصیب ہے۔ اتنی دکھ مصیبتیں اٹھا کر یہاں آئی تو اب ہسپتال کا منہ دیکھ رہی ہے۔"

زبیدہ خاتون کا دردمند دل تڑپ گیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ممانی کے قریب آئیں اور انہیں دلاسہ دینے لگیں۔

"صبر کیجئے بہن! حامی کی بدنصیبی کے دن اب گزر چکے ہیں۔ آنسو پونچھ لیجئے۔ میں آپ لوگوں کی ہر ممکن مدد کروں گی۔"

ماموں نے جلدی سے کہا۔

"ہم نے جب سے کمال میاں کو دیکھا ہے تب ہی سے یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ حامی آپ کے ہاں کنیز بن کر رہے گی لیکن اس کے لیے ہم کو کم از کم سال بھر کا وقت دیجئے۔"

"سال بھر کا وقت؟ وہ کیوں؟" زبیدہ خاتون نے پوچھا۔

"وہ اس لئے.....!" ماموں نے کہا۔ "سیلاب ختم ہونے کے بعد میں اپنی زمین پر ہل چلاؤں گا۔ تمام سال محنت کروں گا۔ ہو سکا تو دوسروں کے ہاں مزدوری بھی کروں گا اور تیس ہزار روپے جمع کر کے بھائی جان کے منہ پر ماروں گا پھر ان سے صاف صاف کہہ دوں گا کہ میں ان کے شرابی بیٹے کو اپنا داماد نہیں بنا سکتا۔"

زبیدہ خاتون نے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کے حوصلے بہت بلند ہیں۔ حامی کو بہو بنا کر مجھے خوشی ہوگی کہ میں نے غیرت مند والدین کی بیٹی کو اپنایا ہے۔ مگر بھائی صاحب ایک سال کا عرصہ بہت ہوتا ہے۔ بہت عرصہ کے بعد میرے لڑکے نے شادی کے لیے رضامندی ظاہر کی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ اس شادی میں تاخیر ہو۔ آپ تیس ہزار روپے مجھ سے لے کر اپنے بھائی جان کو لوٹا دیں۔ آپ کی ساری الجھنیں دور ہو جائیں گی۔"

ماموں اور ممانی کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی۔ پھر ماموں نے سنبھل کر کہا۔

"یہ...... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جس گھر میں بیٹی جائے' وہاں سے ہم قرض لیں؟"

زبیدہ خاتون نے جواب دیا۔

"ابھی آپ یہ نہ سوچیں کہ اس گھر میں آپ کی بیٹی بہو بن رہی ہے۔ سب سے پہلے آپ کو یہ سوچنا چاہئے کہ بیٹی کو کس طرح جلد از جلد ایک شرابی کے رشتے سے آزاد کرا سکتے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر......"

"مگر وگر کچھ نہیں۔ آپ یہ بتائیے کہ مجھے اپنی بہن سمجھتے ہیں یا نہیں؟"

"یہ آپ نے کیسا سوال کیا؟" ماموں نے کہا۔ "آپ تو سگی بہنوں سے بھی بڑھ کر ہیں۔"

زبیدہ خاتون نے کہا۔

"تو پھر آپ بہن کے اس نیک جذبہ سے انکار نہ کریں۔ دیکھئے نا..... آپ اگر بھائی سے تیس ہزار قرض لے سکتے ہیں تو کیا بہن سے نہیں لے سکتے؟"

وہ خوشامدانہ انداز میں سر جھکا کر بولے۔

"بہن..... آپ نے تو ہمیں لاجواب کر دیا ہے۔"

ممانی نے روتے ہوئے کہا۔

"نہ جانے ہماری کون سی نیکی آڑے آ گئی ہے کہ آپ جیسی نیک خاتون ہمیں مل گئیں۔ ہم آپ کے احسانات کے سامنے کبھی سر نہ اٹھا سکیں گے۔"

"احسانات کی بات نہ کریں۔ ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی۔ بھلا ایک بہن کے سامنے آپ لوگوں کا سر کیوں جھکے گا؟"

ممانی نے کہا۔

"ٹھیک ہے لیکن جب دنیا والوں کو معلوم ہو گا کہ ہم نے آپ سے اتنی بڑی رقم لی ہے تو ان کے سامنے ہم سر اٹھا کر بات نہیں کر سکیں گے۔"

"آپ پریشان نہ ہوں۔" زبیدہ خاتون نے کہا۔ "میں زبان کی ایسی کچی نہیں ہوں کہ دوسروں کے سامنے بولتی پھروں۔ یہ بات صرف میرے اور کمال کے سوا کسی کو معلوم نہیں ہو گی۔"

ممانی نے خوش ہو کر آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم آپ کا شکریہ کس طرح ادا کریں۔"

"اس میں شکریہ ادا کرنے کی کیا بات ہے۔ جب میں صفدر کو ایک لڑکی خریدنے کے لیے پندرہ ہزار دے سکتی ہوں تو کیا اپنی بہو کی مصیبتیں دور کرنے کے لیے تیس ہزار نہیں دے سکتی؟"

ماموں اور ممانی ایک دوسرے کو چور نظروں سے دیکھنے لگے۔

پھر ممانی نے کہا۔

"ارے ہاں' آپ نے ایک دن بتایا تھا کہ صفدر میاں کسی لڑکی کو پندرہ ہزار میں حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ پھر اس کا کیا بنا؟"

"بننا کیا تھا؟" زبیدہ خاتون نفرت سے بولیں۔ "اس کے ماموں' ممانی اول درجے کے کمینے ثابت ہوئے۔"

ماموں نے گالی سننے کے باوجود ڈھیٹ بن کر پوچھا۔

"کیوں آخر ہوا کیا؟"

"وہی ہوا جو چکلوں میں ہوتا ہے۔ ان کی بھانجی کے لیے مالدار اسامی پھنس گئی ہوگی۔ شاید اس لئے وہ صفدر کے پہنچنے سے پہلے ہی کہیں چلے گئے۔ وہ بے چارہ بہت اداس رہتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم اس کی اداسی کس طرح دور کریں۔"

اسی وقت صفدر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی ماموں اور ممانی سنبھل کر بیٹھ گئے۔ زبیدہ خاتون نے بڑے پیار سے کہا۔

"یہ لو۔ ذکر ہوتے ہی آ گیا۔ بڑی عمر ہے بیٹے۔ کہاں سے آ رہے ہو؟"

"ہسپتال سے۔"

ممانی نے چونک کر اسے دیکھا پھر گھبرا کر پوچھا۔

"کیا..... تم حامی سے ملے تھے؟"

صفدر نے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں۔ آپ کو کوئی اعتراض ہے؟"

"نن..... نہیں..... ہمیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اب تو وہ تمہارے دوست کی دلہن بننے والی ہے۔"

زبیدہ خاتون نے کہا۔

"ہاں بیٹے۔ میں چاہتی ہوں کہ جلد سے جلد میری بہو بن کر یہاں آ جائے۔"

ماموں نے جلدی سے کہا۔

"آپ چاہتی ہیں تو صفدر میاں بھی یہی چاہیں گے۔ کیوں صفدر میاں؟"

صفدر نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"میرے چاہنے سے ہی یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔"

"کیا مطلب؟" زبیدہ خاتون نے چونک کر پوچھا۔

صفدر نے سنبھل کر جواب دیا۔

"میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میرا چاہنا یا نہ چاہنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ کمال کیا چاہتا ہے۔ وہ آپ لوگوں کے سامنے آ کر یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ یہ شادی جلد ہو جائے۔ میں ہی اس کی طرف سے وکالت کر سکتا ہوں۔"

زبیدہ خاتون نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں..... وہ بہت شرمیلا ہے۔ میرے سامنے کچھ نہیں کہے گا۔ تم ہی کہو بیٹا کہ شادی کے لیے کون سی تاریخ رکھی جائے؟"

صفدر کی سانس جیسے رکنے لگی۔ اسے یوں لگا جیسے اپنی موت کا فیصلہ آپ سنانے والا ہو۔ اس نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

"کل....... حامی کو ہسپتال سے چھٹی مل جائے گی۔ پرسوں شادی کر دیجئے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے جلدی سے منہ پھیر لیا۔

"پرسوں؟" زبیدہ خاتون نے حیرت سے کہا۔ "اتنی جلدی شادی کیسے ہو سکتی ہے؟"

صفدر نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔

"شادی ہو یا بربادی۔ وہ ایک پل میں بھی ہو جاتی ہے۔ میں اپنی بربادی کو کمال کی خوشیوں میں بھلا دینا چاہتا ہوں۔"

زبیدہ خاتون اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی محسوس کرتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ گئیں اور اس کے پیچھے آ کر بولیں۔

"تم پھر رو رہے ہو؟"

"نہیں۔"

"مجھ سے آنکھیں ملاؤ۔"

صفدر تیزی سے پلٹ کر ان سے لپٹ گیا۔

"آنٹی! آپ لوگوں کی محبت اتنی شدید ہے کہ میری محبت کی ناکامی مجھے نہیں رلا سکتی۔ میں محض اپنے زخموں پر مرہم رکھنا چاہتا ہوں اور یہ مرہم ہے کمال کی شادی۔

میرے سینے میں ایک پھانس رہ گئی ہے۔ اسے نکال دیجئے آنٹی! اسے نکال دیجئے۔"

انہوں نے محبت سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"میرے بدنصیب بیٹے۔ تمہاری یہی خوشی ہے تو میں اسے پورا کروں گی۔ کمال کی شادی جلد ہی ہو گی۔"

ممانی نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے ماموں کو واپس چلنے کا اشارہ کیا اور ماموں اس طرح جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے جیسے کوئی کٹھ پتلا اپنے نچانے والے کے اشارے پر کھڑا ہو جاتا ہے۔

☆------------☆------------☆

حامی دلہن بنی رخصت ہو رہی تھی۔

صفدر نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ شادی ہو یا بربادی' وہ ایک پل میں ہو جاتی ہے۔ پھر جہاں دولت ہو' وہاں شادی کے انتظامات میں بھلا کیا دیر ہوتی ہے۔

ماموں اور ممانی کو بھی تیس ہزار روپے مل گئے تھے اور جب سے یہ روپے ملے تھے ان کے دن کا سکون اور رات کی نیند اڑ گئی تھی۔ ماموں کو فکر تھی کہ ان تمام روپوں کو کہیں ممانی غائب نہ کر دیں اور ممانی کو فکر تھی کہ ماموں اس رقم کو کہیں عیاشی میں برباد نہ کر دیں۔ دونوں کو ایک دوسرے پر بھروسہ نہیں تھا۔ دونوں ہی اس دولت پر سانپ بن کر پہرہ دے رہے تھے۔ وہ اس انتظار میں تھے کہ حامی دلہن بن کر رخصت ہو جائے تو اس رقم کا بھی کوئی حساب ہو جائے۔

شادی بڑی ہی سادگی سے ہوئی۔ زبیدہ خاتون نے کہہ دیا تھا کہ زیادہ دھوم دھام کی ضرورت نہیں ہے۔ دل کے جو ارمان ہیں' وہ ولیمہ کے دن پورے کر لئے جائیں گے۔ اس لئے بڑی سادگی سے کمال اور حامی کا نکاح پڑھا کر اسے رخصت کر دیا گیا۔

حامی ایک سجی سجائی کار میں بیٹھ کر چلی گئی۔ اس وقت شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ محلے کے چند مرد اور عورتیں جو اس خوشی میں شریک ہونے کے لیے ممانی کے ہاں آئی تھیں' وہ ایک ایک کر کے رخصت ہو گئیں۔ گھر میں صرف ممانی' ممانی کی بہن اور ماموں رہ گئے۔

ممانی نے ذرا کمر سیدھی کرنے کے لیے چارپائی پر لیٹتے ہوئے کہا۔

"ہائے' میں تو تھک کر چور ہو گئی ہوں۔"

ماموں نے محبت سے ان کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"واقعی آج تمام دن تم مصروف رہی ہو۔ ایک گلاس شربت پی لو۔ تھکن کچھ کم ہو جائے گی۔"

ممانی کی بہن نے کہا تھا۔

"شربت ہے کہاں۔ جتنی بوتلیں آئی تھیں' سب کی سب ختم ہو گئیں۔ کہو تو بازار سے لیموں منگا کر شربت بنا دوں۔"

ماموں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں ایسا نادان نہیں ہوں کہ کھانے پینے کی تمام چیزیں مہمانوں میں تقسیم کر دوں۔ بھئی' اتنی بڑی کامیابی کی خوشی میں ہمارا بھی تو حصہ ہونا چاہئے۔ میں نے شربت کی ایک بوتل بچا کر رکھ لی تھی۔"

ممانی نے مسکرا کر کہا۔

"زندگی میں پہلی بار تم نے ایک بچت کی ہے۔ اگر ایسے ہی روپے پیسے کی بچت کرو تو ہمارا بڑھاپا مزے سے گزر جائے گا۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ مجھے اپنی غلطیوں کا احساس ہو گیا ہے۔ دیکھو نا! اسی لئے آج میں نے شراب کا نام تک نہیں لیا ہے ورنہ شام ہوتے ہی خرید کر لے آتا۔"

ممانی بڑی محبت سے ماموں کے ہاتھ کو دباتے ہوئے بولیں۔

"بچت کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ اب تم ایک بوتل بھی نہ پیو۔ شراب ایک دم سے نہیں چھوڑنا چاہئے۔ تم جانتے ہو کہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ محبت ایک طرفہ نہیں ہوتی۔ تم میرے لئے شربت کی بوتل لا سکتے ہو تو میں بھی تمہارے لئے شراب کی بوتل لا سکتی ہوں۔"

"آہاہا!" ماموں نے خوش ہو کر کہا۔ "آج تمہاری باتیں سن کر جوانی کے دن یاد آ رہے ہیں۔"

ممانی نے چارپائی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"تو پھر آؤ۔ آج ہم جوانی کی یادوں کو تازہ کریں۔"

وہ اٹھ کر اپنے صندوق کے پاس گئیں۔ ماموں بھی اپنے صندوق کے پاس گئے۔ دونوں نے اپنے اپنے صندوق سے بوتلیں نکالیں اور ایک میز کے اطراف کرسیوں پر آ کر بیٹھ گئے۔ ممانی کی بہن نے تین عدد گلاس ان کے سامنے رکھ دیئے۔

ممانی نے شراب کی بوتل کو کھولتے ہوئے کہا۔

"آج ہم دونوں بہنیں تمہارے لئے ساقی بن رہی ہیں۔"

ماموں نے شربت کی بوتل کھولتے ہوئے کہا۔

"اور میں تم دونوں بہنوں کے لیے ساقی بن رہا ہوں۔"

وہ تینوں اس بات پر کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔ ماموں نے دو گلاسوں میں شربت بنا کر دونوں بہنوں کے سامنے رکھ دیا۔

ممانی ایک گلاس میں شراب انڈیل کر بڑھاتی ہوئی بولیں۔

"خدا کرے کہ آج کا نشہ کبھی نہ اترے۔"

ماموں نے جواب دیا۔

"شربت ہو یا شراب، وہ نشہ ہی کیا جو اتر جائے۔ بھئی اپنی محبت کا جادو تو سر چڑھ کر بولتا ہے۔"

وہ تینوں اپنے اپنے گلاس سے چسکی لینے لگے۔ ممانی بولیں۔

"دولت، محبت کی قینچی ہے۔ اچھی بھلی محبت کے ٹکڑے کر کے رکھ دیتی ہے۔ تم سے بڑھ کر میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ وہ تیس ہزار روپے تم اپنے پاس رکھ لو۔"

ماموں نے دوسرا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"نہیں جان من! میری محبت کا امتحان نہ لو۔ وہ روپے تم اپنے ہی پاس رکھو۔ مجھے زندہ رہنے کے لیے صرف تمہاری محبت کا نشہ کافی ہے۔"

"جھوٹے کہیں کے۔" ممانی نے ایک ادا سے بل کھا کر کہا۔ "زندگی بھر تو پیسوں کے لیے لڑتے رہے، اب بڑھاپے میں پینترا بدل کر میری محبت کے گن گا رہے ہو۔"

"ہا ہا ہا...... بھئی پینترا تو تم نے بھی بدلا ہے۔ تیس ہزار کی اتنی بڑی رقم بڑی فراخدلی سے میرے حوالے کرنا چاہتی ہو۔ دیکھو، میں...... الو کا پٹھا نہیں ہوں...... میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ جس ہاتھ سے تم دیتی ہو، اسی ہاتھ سے دوگنا وصول کر لیتی ہو۔

میری بوڑھی پٹاخہ جان! میں تمہاری رگ رگ کو پہچانتا ہوں۔"

ممانی نے خالی گلاس کو میز پر پٹخ کر کہا۔

"تم اول درجہ کے کمینے ہو۔ ہمیشہ مجھ پر شبہ کرتے ہو۔ میری کمائی کھانے والے کتے۔ میں تمہیں کھلا سکتی ہوں تو کتے کی موت مار بھی سکتی ہوں۔"

"چپ رہ کتیا! تو نے جو کچھ بھی کمایا، میری بھانجی کے بل پر کمایا۔ بھانجی میری تھی، چال تیری تھی۔ نہ تیرا احسان مجھ پر ہے، نہ میرا احسان تجھ پر ہے۔ حساب برابر ہو گیا۔"

ماموں نے گلاس کو میز پر رکھ کر ایک ہچکی لی۔

"شراب بڑی تیز ہے۔ ایک ہی گلاس میں ایسا...... معلوم ہوتا ہے۔ جیسے سر پر...... جوتے پڑ رہے ہوں...... کون سی...... شاراب پلائی ہے...... تم نے......؟"

ممانی نے مسکرا کر کہا۔

"میں نے تمہیں...... ایسی...... شراب پلائی ہے...... جس سے حساب برابر ہو جاتا ہے۔ تمہاری...... بھانجی چلی گئی۔ اب تم بھی ہمیشہ...... کے لیے چلے جاؤ گے...... میں اپنے کاندھے پر فالتو بوجھ اٹھا کر...... نہیں چل سکتی۔"

"کیا بکتی ہے؟" ماموں نے میز پر ہاتھ مار کر چیخ ماری۔ زور سے چیخنے کے باعث ان کا سارا جسم کانپنے لگا۔ نگاہوں کے سامنے کمرے کی ہر چیز چکرانے لگی۔ ان کی سماعت میں قہقہے گونجنے لگے۔ ان کے سامنے دو چڑیلیں بیٹھی کھی کھی کھی ہنس رہی تھیں۔

پھر ان چڑیلوں کے چہرے ان کے چاروں طرف چکرانے لگے۔ بڑے بڑے دانت...... پھیلی ہوئی وحشت زدہ آنکھیں اور لانبے لانبے اور نوکیلے ناخن ماموں کی گردن تک بڑھے مگر اس چڑیل کے ہاتھ بھی کانپنے لگے۔ وہ گھبرا کر اپنے گلے پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

"مم...... میرا دل گھبرا رہا ہے۔"

اس نے بہن کی طرف دیکھا۔ بہن کا چہرہ پسینے سے تر تھا اور وہ میز پر ماموں کے قریب جھکی ہوئی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ڈ...... ڈاکٹر کو...... بلاؤ...... شربت میں ضرور کچھ...... گڑبڑ تھی۔"

ممانی لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے چلی گئیں۔ ماموں نے آنکھ کھولی پھر منہ کھولا۔

"آں..... ں..... ں..... تا...... لی..... دونوں ہاتھوں سے..... بجتی ہے....."

"نہیں!" ممانی نے چیخنے کی کوشش کی مگر آواز حلق میں پھنسنے لگی۔

"میرے...... میرے تیس ہزار۔"

وہ لڑکھڑائی ہوئی صندوق کی طرف بڑھیں۔

"وہ...... میرے ہیں....." ماموں چکراتے ہوئے اٹھے۔ ذرا سا لڑکھڑائے پھر میز کا سہارا لے کر سنبھل گئے۔

"اس میں...... میرا...... میرا بھی حصہ ہے۔" ممانی کی بہن بھی اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔

ممانی کھلے ہوئے صندوق پر جھکی ہوئی تھیں اور لرزتے ہاتھوں سے صندوق کے کپڑے ہٹا ہٹا کر اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ بڑی مشکلوں سے وہ تہہ تک پہنچیں۔ پچاس پچاس روپوں کی ایک گڈی وہاں رکھی ہوئی تھی۔ وہ گڈی کو اٹھا کر واپس پلٹیں تو ماموں اور ان کی بہن قریب پہنچ چکی تھیں۔ پھر تینوں میں چھینا جھپٹی اور گالی گلوچ شروع ہو گئی۔

وہ اپنے پیروں پر ڈگمگا رہے تھے۔ ان میں کھڑے رہنے کی بھی سکت نہیں تھی مگر موت کی آخری سرحد پر بھی تیس ہزار روپے انہیں کتوں کی طرح لڑنے پر مجبور کر رہے تھے۔ تینوں کے ہاتھ نوٹوں کے بنڈل پر تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بنڈل کھل گیا اور نوٹ ہاتھ سے نکل کر بکھر گئے۔

وہ نوٹوں کے پیچھے اس طرح لپکے جیسے بچے کٹی ہوئی پتنگ کے پیچھے لپکتے ہیں۔ نوٹ اِدھر بھی تھے' اُدھر بھی۔ ان کے آگے بھی تھے' ان کے پیچھے بھی۔ وہ تینوں فرش پر رینگ رہے تھے۔ اپنے ہاتھوں کے بل گھسٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔

پھر ان میں اتنی بھی سکت نہ رہی کہ نگاہوں کے سامنے پھیلے ہوئے نوٹوں کو ہاتھ بڑھا کر اٹھا سکیں۔ وہ نوٹوں کو سمیٹنے کی بجائے روٹھی ہوئی سانسوں کو سمیٹنے کی کوشش کرنے لگے اور حسرت بھری نظروں سے اپنے اطراف پھیلے ہوئے نوٹوں کو تکنے لگے۔

اچانک باہر والے دروازے پر کسی نے دستک دی۔

لیکن دروازہ کون کھولتا؟

اگر ان تینوں میں اتنی سکت ہوتی کہ وہ اٹھ کر دروازے تک جا سکتے تو دروازے تک جانے کی بجائے پہلے نوٹوں کو سمیٹنے کی کوشش کرتے۔ وہ اسی طرح فرش پر پڑے رہے۔

دوسری بار دستک ہوئی۔ ماموں کا سر دو نوٹوں پر ڈھلک گیا۔

تیسری بار دستک ہوئی۔ ممانی کی بہن کا سر تین نوٹوں پر سو گیا۔

چوتھی دستک پر ممانی نے سر اٹھایا۔ زندگی بھر پیسوں کی چھما چھم پر ناچنے والی عورت اتنی جلدی تھک کر گر نہیں سکتی تھی۔ اس میں ذرا دم باقی تھا۔ وہ گھسٹتی ہوئی آگے بڑھی۔ شاید آنے والا اس کی زندگی بچالے۔ اس کو کسی ڈاکٹر کے پاس لے جائے۔ وہ گھسٹنے لگی۔ گہری گہری سانسیں لے کر زندگی کو واپس بلانے کی کوشش کرنے لگی۔

دم توڑتی ہوئی زندگی ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں آئی۔ دروازہ چند قدموں کے فاصلہ پر رہ گیا۔ اتنے فاصلہ سے تو وہ اپنے گاہکوں کو صرف ایک اشارے سے مار دیتی تھی۔ آج موت یہی داؤ اس پر آزما رہی تھی۔

پھر ایک بار دستک ہوئی۔

"آہ...... ہاں..... آہ...... ہاں....."

وہ کراہتی ہوئی دروازے تک آئی۔ بیچ دروازے پر کنڈی لگی ہوئی تھی۔ اس نے آخری تمام قوتوں کو سمیٹ کر فرش پر لیٹے ہی لیٹے ایک ہاتھ کو اٹھایا۔ ہاتھ کنڈی تک پہنچا' پھر ایک دھڑاکے سے دروازہ کھل گیا۔

سامنے یوسف کھڑا ہوا تھا۔

اس کے بال بکھرے ہوئے تھے' داڑھی بڑھی ہوئی تھی' کپڑے گرد سے اٹے ہوئے تھے' ممانی کی دھندلائی ہوئی آنکھوں سے وہ بالکل ملک الموت نظر آ رہا تھا۔

اس نے جلدی سے ممانی پر جھکتے ہوئے پوچھا۔

"کیا ہو گیا..... آپ کو کیا ہو گیا ہے؟"

ممانی پھیلی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھے جا رہی تھیں۔ کچھ کہنے کی بجائے وہ کراہ کر رہ گئیں۔

یوسف نے دروازے کو بند کیا اور انہیں اٹھانے لگا۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ ممانی میں کھڑے رہنے کی سکت بھی نہیں ہے۔

"انکل کہاں ہیں؟ حامی کہاں ہے؟"

پھر حامی کی تلاش نے اسے دوسرے کمرے کی طرف جانے پر مجبور کر دیا۔ وہ ممانی کو اسی طرح فرش پر چھوڑ کر آگے بڑھا۔ مگر دوسرے کمرے میں پہنچتے ہی ٹھٹک کر رہ گیا۔

دو لاشیں نوٹوں کے بستر پر سو رہی تھیں۔

اتنے سارے نوٹ دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ پھر وہ سب کچھ بھول گیا۔ بھوکے کتے کی طرح وہ نوٹوں کی طرف جھپٹا اور ایک ایک نوٹ کو گن گن کر اٹھانے لگا۔ پچاس..... سو...... ڈیڑھ سو...... دو سو...... ماموں اور ان کی سالی کے سرہانے سے بھی پانچ عدد نوٹ برآمد ہوئے۔ اس نے پھر ایک بار اچھی طرح گنتی کی۔ پورے تیس ہزار تھے۔

اس نے نوٹوں کو اپنی جیبوں میں ٹھونس لیا۔ مارے خوشی کے اس کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ اس نے مستی میں جھوم کر میز کی طرف دیکھا۔ شراب کی بوتل کو دیکھتے ہی طبیعت لہرا گئی۔

"ہائے' مرنے والے نے میرے لئے دولت بھی چھوڑی اور شراب بھی۔ خدا مرحوم کو جنت نصیب کرے۔"

وہ خوشی میں جھومتا ہوا میز پر آیا اور بوتل اٹھا کر گلاس میں شراب ڈالنے لگا۔

اسی وقت دوسرے کمرے سے کراہیں سنائی دیں۔ ان کراہوں میں بڑا ہی کرب تھا۔ جیسے کوئی اذیت ناک موت مر رہا ہو۔ اسے یاد آیا کہ وہ ممانی کو دوسرے کمرے میں چھوڑ آیا ہے۔ پھر اسے خیال آیا کہ ممانی کی حالت بھی غیر تھی۔ شاید وہ بھی مرنے والی ہیں۔

"یہ کیسے مر گئے؟ اور وہ کیوں مرنے والی ہے؟" یہ سوالات ذہن میں ابھرے۔ وہ سہمی ہوئی نظروں سے شراب اور شربت کی بوتلوں کو دیکھنے لگا۔

"حامی کہاں ہے؟"

پھر ایک سوال ابھرا۔

وہ تیزی سے آگے بڑھا اور تیسرے چوتھے کمرے میں اسے تلاش کرنے لگا۔ پلاؤ کی دیگ' جھوٹے برتن' کمرے کے اندر چھوٹا سا سرخ شامیانہ' جس کے سائے میں دلہن کو بٹھا کر رسمیں ادا کی جاتی ہیں۔ یہ سب چیزیں دیکھ کر اسے یقین ہو گیا کہ حامی کسی موٹی اسامی کے ہاتھ بیچ دی گئی ہے اور یہ تیس ہزار اسی سودے کی رقم ہے۔

وہ غصے میں دانت پیستا ہوا دوسرے کمرے میں آیا اور ماموں کی لاش کو ایک زور کی ٹھوکر ماری۔

"بے ایمان' تیرا یہی انجام ہونا چاہئے تھا۔"

اس نے پلٹ کر شراب سے بھرے ہوئے گلاس کو دیکھا لیکن اب وہ سب کچھ سمجھ چکا تھا۔ اس گھر کا پانی پینا بھی اپنی موت کو دعوت دینا تھا۔

وہ تیزی سے چلتا ہوا اس کمرے میں آیا' جہاں ممانی دم توڑ رہی تھیں۔

اس نے قریب بیٹھ کر کہا۔

"تم نے حامی کو بیچ دیا ہے؟ بولو کہاں ہے وہ؟"

وہ التجا آمیز نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں اور اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں کہ پہلے کسی طرح مجھے بچا لو۔

"تم بہت ہی سخت جان ہو۔ سب مر گئے' حامی بھی میرے لئے مر چکی ہے' پھر تم کیوں زندہ ہو؟"

اس نے ممانی کی گردن دبوچ لی۔

دور محلے میں کوئی گھڑیال رات کے بارہ بجا رہا تھا۔ ٹن...... ٹن...... ٹن...... ٹن.......

☆============☆============☆

رات کے بارہ بجے تھے۔

صفدر کے سامنے رکھا ہوا ایش ٹرے سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ ایک اور سگریٹ نکال کر جلانے لگا۔ کمال نے اس سے سگریٹ چھین کر پھینک دیا اور بگڑ کر بولا۔

"حد ہوتی ہے سگریٹ پینے کی۔ پاگل نہ بنو صفدر! غموں کی آگ سگریٹ کی راکھ سے نہیں بجھ سکتی۔"

"اب مجھے کوئی غم نہیں ہے۔ کوئی غم نہیں ہے کمال! دیکھو تو کتنی رات ہو گئی ہے اور تم ابھی تک میرے پاس ہو۔ تمہیں...... تمہیں دلہن کے کمرے میں جانا چاہیے۔"

"جاؤں کیسے؟ جب تک تم میری خوشیوں میں شریک نہیں ہو گے۔ میں نہیں جاؤں گا۔"

صفدر نے چونک کر دیکھا۔

"پاگل ہوئے ہو۔ میں تمہارا شریک کیسے بن سکتا ہوں؟"

کمال نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ارے بھئی! میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ تم میرے ساتھ دلہن کے پاس چلو۔ یاد ہے تم نے کہا تھا کہ میری خوشی کو اپنی خوشی سمجھ کر ناکامیوں کو بھول جاؤ گے۔"

"ہاں یاد ہے۔ میں ناکامیوں کو بھلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

کمال نے اس کے شانے پر محبت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"بھلانے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہمیشہ مسکراتے رہو۔ بات بات پر قہقہے

لگاتے رہو۔ مجھے یقین ہے صفدر! تمہاری زندگی میں پھر سے بہار آئے گی۔"

صفدر دلہن کے کمرے کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"بہار اب نہیں آئے گی۔ جو چیز پرائی ہو جاتی ہے وہ پھر اپنی نہیں ہوتی۔ بہر حال میں مسکرا رہا ہوں۔ تمہارے ارمانوں کی تکمیل کے لیے دل سے دعائیں مانگ رہا ہوں۔ جاؤ کمال' جاؤ۔ ایسی رات بار بار نہیں آتی۔"

"جاؤں؟" کمال نے مسکرا کر پوچھا۔

"ہاں اور نہیں تو کیا؟ کیا ساری رات یہیں گزار دو گے؟"

"نہیں' جانا تو ہے ہی۔ میں جاؤں گا' مگر....!"

"مگر کیا؟"

کمال نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"یار سمجھ میں نہیں آتا کہ سہاگ کی پہلی رات کو دلہن سے کس طرح باتیں کرنا چاہئے۔ دیکھو نا' اب تک ہسپتال میں' میں نے اس سے بہت سی باتیں کی ہیں۔ مگر یہ ہسپتال تو نہیں ہے۔ یہاں تو وہ گھونگھٹ میں شرماتی رہے گی۔ میں جو کچھ بھی کہوں گا جواب نہیں دے گی۔ اب تم ہی بتاؤ۔ کون سی ایسی بات کہی جائے کہ وہ بولنے پر مجبور ہو جائے۔"

"مم...... میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" اس نے منہ پھیر کر کہا۔ "تم مجھ سے زیادہ سمجھ سکتے ہو اور بول سکتے ہو۔ اس لئے کہ وہ تمہاری محبت ہے۔"

"بھئی! محبت میری ہو یا تمہاری۔ جذبات کی زبان ایک ہی ہوتی ہے۔ تم اپنی زبان سے جو کچھ کہو گے' اسے میں حامی کے سامنے اپنی زبان سے ادا کروں گا۔"

"تم خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔"

"نہیں صفدر! مجھے یاد ہے کہ تم اپنی محبوبہ کا ذکر کتنے شاعرانہ انداز میں کیا کرتے تھے۔ میں بھی وہی انداز اپنانا چاہتا ہوں۔ سوچو کہ آج وہ یہاں ہوتی تو تم بھی دولہا بن کر اس کے کمرے میں جاتے' اسے سرخ جوڑے میں دیکھ کر کہتے' کمال وہ تمہاری حامی سے زیادہ خوبصورت ہے' اس کی خوبصورتی کی مثال شاعروں کو بھی نہیں مل سکتی۔"

کمال کہہ رہا تھا...... اور صفدر کی نگاہوں کے سامنے حامی کا چہرہ طلوع ہو رہا تھا۔

گھونگھٹ کی سرخی میں اس کے رخسار تمتما رہے تھے۔ لانبی پلکوں کی جھالر پر افشاں چمک رہی تھی۔ لبوں کی کلیاں کھلنے کے لیے زیرلب مسکرا رہی تھیں۔

صفدر نے عالم خیال میں کہا۔

"پھول سب کے لیے پھول ہی ہوتا ہے۔ مگر اس کی خوبصورتی شاعری کی زبان سے ہی سمجھی جاتی ہے۔ وہ پھول سہاگ کے جوڑے میں کھل رہا ہے۔ اگر میں اپنی حامی کے روبرو ہوتا تو کہتا......"

جذبوں کی اڑان نے اسے دولہا بنا کر حامی کے سامنے پیش کر دیا۔

"حامی! پیار سچا ہو تو ملن کی رات آ ہی جاتی ہے۔ دیکھو' میں کتنی دیواریں گرا کر تمہارے پاس آیا ہوں۔ میں نے سہاگ کے بندھن میں تمہیں باندھ لیا ہے۔"

حامی شرم سے سمٹنے لگی۔ صفدر اس کے قریب پلنگ پر آ کر بیٹھ گیا۔

"آج سے پہلے ہم کتنی بار ملے ہیں لیکن آج کی ملاقات مختلف ہے۔ تمہیں شرماتے لجاتے دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ میں ایک نئی حامی سے مل رہا ہوں۔ عورت وہی ہوتی ہے مگر اس کی شرمیلی ادائیں اسے ایک نئے روپ میں بدل دیتی ہیں۔"

اس نے حامی کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"پہلے ان ہاتھوں میں مہندی کی لالی اور اس کی خوشبو نہیں تھی۔ آج یہ حنائی خوشبو میرے دل و دماغ کو مہکا رہی ہے۔ تمہارے ہاتھ اتنے خوبصورت ہیں تو نہ جانے آج تمہارا چہرہ کتنا روشن ہوگا۔ یہ گھونگھٹ کی دیوار ہٹا دو' حامی! میری آنکھیں تمہارے دیدار کو ترس رہی ہیں۔"

صفدر نے اس کی انگلی میں ایک انگوٹھی پہنائی' پھر بڑے چاؤ سے اس کے گھونگھٹ کو الٹ دیا۔ نگاہوں کے سامنے حامی کا چہرہ جگمگ جگمگ کرنے لگا۔ گھونگھٹ میں ٹکے ہوئے سلمہ ستاروں کی جھلمل جھلمل اس کے حسن کو دوبالا کر رہی تھی۔

صفدر نے پھول کے اس کنوارے چہرے کو اپنی دونوں ہتھیلیوں میں سجا لیا۔

"دنیا کی ساری خوبصورتی سمٹ کر میری ہتھیلیوں میں آ گئی ہے حامی! میری آرزو! میری زندگی! وعدہ کرو کہ ہمیشہ میری بن کر رہو گی۔ وعدہ کرو......"

"وعدہ؟" حامی چونک گئی۔

"وعدہ....... وعدہ....... وعدہ........" اس کے ذہن میں ایک انجانے وعدوں کی کیلیں چبھنے لگیں۔

صفدر نے کہا۔

"ہاں' وعدہ کرو کہ میرے ساتھ جیو گی۔ میرے ساتھ مرو گی۔ وعدہ کرو!"

حامی کا سر چکرانے لگا۔

"جینا میرے ساتھ۔ مرنا میرے ساتھ۔ زندگی میں کتنے ہی وعدے ہوتے ہیں مگر آخری اور مستحکم وعدہ خاوند کے ساتھ ہوتا ہے۔"

زندگی میں کتنے ہی وعدے ہوتے ہیں۔ حامی کے کانوں میں وعدوں کی بازگشت چکرانے لگی۔ نگاہوں کے سامنے کتنے ہی وعدوں کی پرچھائیاں گڈمڈ ہونے لگیں۔ پہلا وعدہ' دوسرا وعدہ' تیسرا وعدہ' جو اب آخری وعدہ بننے کا اصرار کر رہا تھا۔

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر یک بیک چیخنے لگی۔

"نہیں..... نہیں..... میں وعدہ نہیں کر سکتی۔ نہیں کر سکتی۔"

پھر وہ چیختے چیختے ہانپنے لگی۔ اس کی آنکھیں وحشت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ پھر وہ بیٹھے ہی بیٹھے ادھر سے ادھر ڈگمگائی اور بستر پر گر پڑی۔

صفدر اچانک اپنے خیالات کی حسین دنیا سے چونک کر حقیقت کی دنیا میں آ گیا۔ اسے کمال کے چیخنے کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا تو کمال گھبرایا ہوا دلہن کے کمرے سے باہر آ رہا تھا۔ پھر وہ اپنی والدہ کے کمرے کی طرف دوڑتے ہوئے چیخنے لگا۔

"امی..... امی! حامی بے ہوش ہو گئی ہے۔"

صفدر سکتے کی حالت میں حامی کے کمرے کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ اپنے خیالات میں اس طرح کھویا ہوا تھا کہ اسے پتہ ہی نہ چلا' کب اس کے پاس سے کمال اٹھ کر چلا گیا تھا۔ اسے خیالی حامی سے بہلا کر خود جیتی جاگتی حامی سے بہلنے گیا تھا۔

لیکن وہ بے ہوش کیسے ہو گئی؟

صفدر سوچتا ہی رہ گیا۔

زبیدہ خاتون اپنے کمرے سے نکل کر حامی کے کمرے کی طرف دوڑی جا رہی

تھیں۔ چیخ و پکار سن کر گھر کے ملازم بھی آ گئے تھے۔ کمال دوڑتا ہوا صفدر کے قریب رکھے ہوئے فون کے پاس آیا اور ریسیور اٹھا کر ڈائل کرنے لگا۔

"یہ...... یہ کیا ہو گیا؟" صفدر نے حیران ہو کر پوچھا۔ "وہ بے ہوش کیسے ہو گئیں؟"

کمال نے جھلا کر کہا۔

"یار تم یہاں منہ دیکھتے ہوئے کھڑے ہو۔ حامی کے پاس جاؤ۔ امی اکیلی ہیں۔"

صفدر پریشان ہو کر سوچنے لگا۔ وہ حامی کے کمرے میں جائے گا مگر وہ دلہن کا کمرہ اس کے لیے تو نہیں سجایا گیا تھا۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ تقدیر اس سے یہ عجیب سا مذاق کیوں کر رہی ہے؟

وہ ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے دلہن کی طرف جانے لگا۔ اسے اپنے پیچھے کمال کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"ہیلو ڈاکٹر...... میری وائف اچانک بیہوش ہو گئی ہیں۔ پلیز آپ فوراً چلے آئیں۔"

صفدر دروازے پر آ کر رک گیا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے وہ خوبصورت دلہن پلنگ پر بے ہوش پڑی تھی۔ زبیدہ خاتون اس کے چہرے پر پانی چھڑک رہی تھیں۔

"ہائے، دیکھو تو کتنی گرمی ہے۔ پسینے میں بھیگ رہی ہے۔ ذرا پنکھا تیز کرو۔" وہ بڑبڑانے لگیں۔

صفدر نے سوئچ بورڈ کی طرف ہاتھ بڑھا کر پنکھے کی رفتار تیز کر دی۔

اس وقت تک کمال بھی کمرے میں آ گیا۔ زبیدہ خاتون، حامی کے تمام زیورات ایک ایک کر کے اتار رہی تھیں۔ انہوں نے بیٹے سے پوچھا۔

"آخر یہ اچانک بیہوش کیسے ہو گئی؟"

"کیا بتاؤں امی! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ انہیں کیا ہو گیا تھا۔ اچانک ہی چیخ مار کر بے ہوش ہو گئیں۔"

زبیدہ خاتون نے گھبرا کر کہا۔

"اللہ خیر کرے۔ لڑکی پر کوئی آسیب تو نہیں ہے۔"

"امی آپ تعلیم یافتہ ہو کر ایسی باتیں کرتی ہیں۔ ڈاکٹر کو آنے دیجئے۔ ہو سکتا ہے

کہ بے ہوشی کی صحیح وجہ معلوم ہو جائے۔"

صفدر بڑی تشویش سے حامی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

تھوڑی دیر میں ڈاکٹر بھی آ گیا۔ اس نے حامی کا معائنہ کرنے کے بعد کہا۔

"گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ یہ آپ ہی آپ ہوش میں آ جائیں گی۔ میں طاقت کے انجکشن دے دیتا ہوں۔"

پھر اس نے انجکشن تیار کرتے ہوئے تمام لوگوں سے کہا۔

"آپ لوگ تھوڑی دیر کے لیے ہمیں تنہا چھوڑ دیں۔ میں کمال صاحب سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

زبیدہ خاتون، صفدر اور دوسرے ملازم کمرے سے باہر جانے لگے۔ کمال نے کہا۔

"صفدر ذرا ٹھہرو۔"

صفدر رک گیا۔ تمام لوگ باہر چلے گئے۔ کمال نے ڈاکٹر سے کہا۔

"ڈاکٹر! میں جانتا ہوں کہ آپ مجھ سے کس قسم کے سوالات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے اپنے دوست کو اس لئے روک لیا ہے کہ میری کوئی بات اس سے چھپی نہیں رہتی۔"

ڈاکٹر نے کہا۔

"ویل، ایزیو پلیز۔"

کمال نے کہا۔

"یہ شادی ہماری باہمی پسند سے ہوئی ہے۔ میری وائف نہ تو مجھ سے نفرت کرتی ہیں اور نہ ہی مجھ سے خوفزدہ رہتی ہیں۔ میں نے اس کمرے میں آ کر ان سے باتیں کیں تو وہ دلہنوں کی طرح شرما رہی تھیں اور مسکرا رہی تھیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ یک بیک چیخ مار کر بیہوش کیسے ہو گئیں۔"

"ہونہہ!" ڈاکٹر نے کہا۔ "آپ ذہن پر زور دے کر سوچئے۔ کہیں آپ کی زبان سے کوئی ایسی بات نہ نکل گئی ہو، جو آپ کی وائف کے لیے خوف زدہ ہونے کا سبب بن گئی ہو۔"

"کوئی ایسی بات نہیں ہے ڈاکٹر۔ بہت سی لڑکیاں پہلے پہل مرد کی قربت سے سہم جاتی ہیں لیکن میں نے تو ان کے قریب آ کر انہیں ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ یہ وہاں بیٹھی

ہوئی تھیں اور میں اس جگہ بیٹھا ہوا تھا۔"

"تعجب ہے!"

ڈاکٹر سوچنے لگا۔ پھر اس نے پوچھا۔

"اچھا یہ بتائیے' آپ کی وائف چیخنے کے دوران کیا کہہ رہی تھیں؟"

"یہ..... کہہ رہی تھیں کہ..... نہیں! میں وعدہ نہیں کر سکتی..... میں وعدہ نہیں کر سکتی۔"

صفدر چونک کر کمال کو دیکھنے لگا۔

کمال کہہ رہا تھا۔

"ڈاکٹر! سہاگ کی پہلی رات ہر خاوند اپنی بیوی سے پیار و محبت کے وعدے کرتا ہے۔ میں نے بھی حامی سے کہا کہ وہ زندگی بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ کرے۔ اس پر وہ گھبرا گئیں۔ پہلے میں نے ان کی گھبراہٹ پر توجہ نہیں دی اور ایک مستحکم وعدہ کے لیے اصرار کرتا رہا تب ہی وہ اچانک چیخیں مارتی ہوئی بے ہوش ہو گئیں۔"

ڈاکٹر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں' جن کی بظاہر کوئی اہمیت نہیں ہوتی لیکن ایک خاص مقام پر پہنچ کر وہ اتنی اہم ہو جاتی ہیں کہ انسان اس کے لئے پاگل ہو جاتا ہے۔ مسٹر کمال کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ شادی سے پہلے آپ کی وائف نے آپ سے کوئی وعدہ کیا ہو اور کسی وجہ سے اس وعدے کو پورا نہ کر سکی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اسی وعدہ خلافی کا احساس ان کے حواس پر اس قدر چھا گیا ہے کہ اب وہ آئندہ کسی قسم کا وعدہ نہیں کرنا چاہتی ہیں۔"

صفدر کے ہونٹوں پر ایک بے جان سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ کمال نے کہا۔

"ڈاکٹر! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ شادی سے پہلے ہمارے درمیان کسی قسم کا وعدہ نہیں ہوا تھا۔"

"آپ اپنی وائف کو کتنے عرصے سے جانتے ہیں؟"

"زیادہ نہیں۔ یہی کوئی بیس دن کی ملاقات ہے۔"

"صرف بیس دن؟"

"جی ہاں۔"

"آپ ان کی ابتدائی زندگی کے متعلق کچھ جانتے ہیں؟"

کمال جانتا ہی کیا تھا کہ جواب دے سکتا۔ اس نے صفدر کی طرف دیکھا پھر کہا۔

"یہ سیلاب زدہ علاقے سے آئی ہیں۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا۔"

ڈاکٹر نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"ایک خاوند کی حیثیت سے آپ کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ ان کی ابتدائی زندگی کس طرح گزری ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس وعدہ کی حقیقت آپ پر روشن ہو جائے۔"

صفدر گھبرا کر ڈاکٹر کو دیکھنے لگا۔ اس کے دل نے پوچھا' کیا حامی اپنے پچھلے وعدوں کی داستان سنا سکے گی؟ شوکت سے کیا ہوا وعدہ..... صفدر سے کیا ہوا وعدہ...... اور اب کمال سے وعدہ کرتے کرتے وہ وعدوں کے بھنور میں پھنس کر رہ گئی تھی۔

جو لڑکیاں اپنی محبت کو مٹھائی کی طرح لوگوں میں تقسیم کرتی ہیں ان کا انجام یہی ہوتا ہے۔ کسی نہ کسی مقام پر پہنچ کر وہ ٹھوکر کھا ہی جاتی ہیں۔

اس نے حامی کی طرف دیکھا۔ اب ہولے ہولے اس کی کراہیں سنائی دے رہی تھیں۔ ڈاکٹر اس کی کلائی تھام کر نبض دیکھنے لگا۔

اس وقت تک زبیدہ خاتون بھی کمرے میں آ گئیں۔ انہوں نے آتے ہی پوچھا۔

"کیا ہوش آ گیا؟"

"جی ہاں!"

حامی آنکھیں کھول کر چاروں طرف حیرت سے دیکھ رہی تھی پھر کمال کو دیکھ کر وہ اٹھنے لگی۔ زبیدہ خاتون نے قریب پہنچ کر کہا۔

"نہیں بیٹا! لیٹی رہو۔ تمہارا اٹھنا مناسب نہیں ہے۔"

ڈاکٹر حامی کے بازو میں انجکشن دینے لگا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے پوچھا۔

"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"جی ٹھیک ہوں۔ شکریہ!" وہ ہولے سے بولی۔

"میں آپ سے کچھ پوچھ سکتا ہوں؟" ڈاکٹر نے کہا۔

"جی ہاں پوچھئے!"

"آج سے بیس دن پہلے آپ کس علاقے میں رہتی تھیں؟"

حامی نے پریشان ہو کر ڈاکٹر کو دیکھا اور پوچھا۔

"آپ یہ بات کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"آپ کی بیہوشی کی وجہ معلوم کرنے کے لیے ایسے کئی سوالات کرنا چاہتا ہوں مثلاً یہ کہ آپ کی تعلیم کیا ہے؟ آپ نے اب تک کس قسم کی سوسائٹی میں زندگی گزاری ہے؟ اور آپ کے رشتے دار کون ہیں اور کہاں کہاں رہتے ہیں؟"

حامی کی پریشانی بڑھ گئی۔ وہ اپنے متعلق اتنا ہی جانتی تھی جتنا کہ ماموں اور ممانی نے بتایا تھا۔ مگر ڈاکٹر تو اس سے بھی آگے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔

وہ شش و پنج میں رہ گئی اور ایک ایک کے چہرے کو تکنے لگی۔

زبیدہ خاتون نے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! یہ بہت کمزور ہے۔ جواب نہیں دے سکے گی۔ میں جو کچھ اس کے متعلق جانتی ہوں وہ آپ کو بتائے دیتی ہوں۔"

"سوری بیگم صاحبہ!" ڈاکٹر نے کہا۔ "میں نے یہ نہیں کہا ہے کہ مریضہ کسی سوال کا تفصیلی جواب دے۔ میں نہایت ہی مختصر سے جوابات ان کی زبان سے سننا چاہتا ہوں۔"

کمال نے حامی سے کہا۔

"حامی! میں جانتا ہوں کہ تم بہت پریشان ہو لیکن ڈاکٹر صاحب جو کچھ پوچھ رہے ہیں، تمہاری بھلائی کے لئے پوچھ رہے ہیں۔"

"مم...... میں کیا بتاؤں؟" حامی نے کہا۔ "میں تو عجیب الجھن میں پڑ گئی ہوں۔"

"کیسی الجھن؟" کمال نے پوچھا۔

حامی نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

"میں...... میں اپنی پچھلی زندگی کے متعلق کچھ نہیں جانتی ہوں....."

"کیا؟" تمام لوگ چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

صفدر بھی اسے غیریقینی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ حامی دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔

"میں کون ہوں؟ کہاں سے آئی تھی؟ کس ماحول میں، میں نے پرورش پائی ہے؟ یہ باتیں مجھے بالکل یاد نہیں ہیں۔ میرے والدین کہتے ہیں کہ میں اپنی یادداشت کھو چکی ہوں۔"

تمام لوگ حیرت سے منہ کھولے اسے دیکھ رہے تھے۔

کمال نے آگے بڑھ کر کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جب تم تمام باتیں بھول چکی ہو تو تمہیں یہ کیسے یاد رہ گیا کہ وہ تمہارے والدین ہیں؟"

"میں انہیں بھی نہیں جانتی تھی، انہوں نے خود ہی بتایا تھا کہ وہ میرے والدین ہیں۔"

"بڑی عجیب سی بات ہے۔" زبیدہ خاتون نے کہا۔ "مگر حامی یہ بات تم نے پہلے کیوں نہیں بتائی؟"

"امی نے منع کیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ اگر آپ کو معلوم ہو گیا کہ میں اپنی زندگی کے متعلق کچھ نہیں جانتی تو آپ مجھے کمزور دماغ کی لڑکی سمجھیں گے۔"

"توبہ ہے!" انہوں نے ناگواری سے کہا۔ "ایسی بھی کیا رازداری! ان کے ساتھ اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی انہیں ہم پر اعتماد نہیں ہے۔ سچ ہے اس دنیا میں اب نیکی کی قدر نہیں رہی۔"

صفدر خاموش کھڑا ایک عجیب سی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اس نے پوچھا۔

"تمہیں کب پتہ چلا کہ تم اپنی یادداشت کھو چکی ہو؟"

حامی نے صفدر کو دیکھا۔ ایک لمحہ تک اسی طرح دیکھتی رہی اور سوچتی رہی پھر وہ آہستگی سے بولی۔

"جس دن آپ لوگ مجھے اٹھا کر ہسپتال لے گئے تھے۔ اس کی پچھلی رات کو جب میری آنکھ کھلی تو میرے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا کہ میں کون ہوں اور کہاں پڑی ہوئی ہوں۔ امی اور ابا نے یقین دلایا کہ وہ میرے والدین ہیں۔ وہاں

ایک ڈاکٹر بھی تھا۔ اس نے بھی یہی کہا تو مجھے یقین آ گیا۔

"پھر دوسرے دن آپ آئے اور مجھے چارپائی سے اٹھا کر سٹریچر پر ڈالنے لگے تو مجھے ایسا لگا جیسے میں آپ کو جانتی ہوں۔"

"مم..... مجھے؟" صفدر گھبرا کر کمال کی طرف دیکھنے لگا۔

کمال زبیدہ خاتون اور ڈاکٹر بھی اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ صفدر نے جلدی سے کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم مجھے کس طرح جانتی ہو؟"

حامی نے جواب دیا۔

"ہاں' میں نے بہت سوچا لیکن سمجھ میں نہیں آیا کہ میں نے تمہیں کہاں دیکھا ہے۔ پھر امی نے مجھے یقین دلایا کہ یہ محض میرا بھٹکا ہوا خیال ہے۔"

صفدر نے اطمینان کی سانس لے کر کمال کی جانب دیکھا۔ کمال نے اپنی والدہ سے کہا۔

"امی! ہمیں اسی وقت حامی کے والدین کو بلا کر بات کرنا چاہیے کیونکہ جو باتیں حامی نہیں جانتیں' وہ اُن سے معلوم ہو جائیں گی۔"

زبیدہ خاتون نے کہا۔

"نہیں بیٹے! رات بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ کل صبح تو وہ خود ہی بیٹی کو دیکھنے آئیں گے۔ اس وقت ان سے باتیں ہو جائیں گی۔"

ڈاکٹر نے اپنی رسٹ واچ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں' رات بہت گزر چکی ہے۔ مجھے اجازت دیجئے۔ کل صبح آ کر میں انہیں دیکھ جاؤں گا۔"

وہ بیگ اٹھا کر جانے لگا۔ زبیدہ خاتون بھی اسے فیس دینے کے لیے کمرے سے باہر جانے لگی۔ ڈاکٹر نے دروازے پر پلٹ کر معنی خیز انداز میں کہا۔

"مسٹر کمال! آپ کی وائف کو تنہائی اور سکون کی ضرورت ہے۔ بی وائز..."

"جی بہت اچھا!"

ڈاکٹر مسکراتا ہوا چلا گیا۔

کمال نے پلٹ کر صفدر کی طرف دیکھا۔ صفدر بڑی محبت سے اور بڑی گہری نظروں سے حامی کو دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔

قریب پہنچ کر اس نے حامی کا ہاتھ تھام لیا۔

"حامی! پہلے تو یہی سنا تھا کہ تم سیلاب زدہ علاقہ کی ایک تباہ حال لڑکی ہو۔ مگر آج پتہ چلا کہ تم کتنی مظلوم ہو۔ یہ کیسی بدنصیبی ہے کہ تم اپنے آپ کو بھول چکی ہو۔ میں..... میں تمہاری دل سے قدر کرتا ہوں۔ غم نہ کرو حامی! اب تمہیں کمال جیسا خاوند نصیب ہوا ہے۔ تم نے جو کچھ کھویا ہے' اس سے زیادہ پا لیا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے حامی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور وہاں سے پلٹ کر تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

کمال گہری نظروں سے اس دروازے کو تک رہا تھا۔ جہاں سے ابھی صفدر گزر کر گیا تھا۔

☆------------☆------------☆

حامی سہاگ کی سیج پر تنہا سوئی۔ ڈاکٹر نے کمال کو اشارتاً سمجھا دیا تھا کہ وہ ذہنی طور پر الجھی ہوئی ہے۔ لہٰذا اسے تنہائی اور سکون کی ضرورت ہے۔

کمال کے نصیب میں سہاگ رات نہیں تھی۔ اس نے دوسرے کمرے کی طرف جاتے ہوئے صفدر سے کہا۔

"صفدر! ہم دونوں کی کہانی ایک ہے۔ تم محبت میں ناکام ہوئے ہو اور میں سہاگ کے کمرے سے نامراد لوٹ رہا ہوں۔ ہم دونوں کے مقدر میں ناکامی لکھی ہے۔"

صفدر نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"دوست! مایوس کیوں ہوتے ہو۔ تمہاری ناکامی عارضی ہے۔ آج نہ سہی۔ کل مرادوں بھری رات تمہاری زندگی میں ضرور آئے گی۔"

"کل کی بات کون جانتا ہے صفدر۔ آج جو لمحہ اپنا تھا' کل وہ کسی اور کا بھی ہو سکتا ہے۔"

"تمہیں اپنی بیوی کے متعلق ایسی بات نہیں سوچنا چاہئے۔"

"بیوی!" کمال نے تلخی سے ہنستے ہوئے کہا۔ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں نے کسی کی بیوی یا کسی کی محبوبہ کو اپنی بیوی بنا لیا ہو۔ وہ بے چاری تو اپنے متعلق کچھ بھی نہیں جانتی۔"

"وہ نہیں جانتیں تو تم جاننے کی کوشش کرو۔"

"کیسے؟" کمال نے پوچھا۔

"کل حامی کے والدین آئیں گے۔ ان سے ساری حقیقت معلوم ہو جائے گی۔"

"انہیں حقیقت بتانا ہوتی تو وہ چھپاتے ہی کیوں؟ وہ جو کچھ بھی کہیں گے' مجھے اس پر یقین نہیں آئے گا۔"

"تو پھر دل کی آنکھوں سے دیکھ کر سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس کی آنکھوں کی شرم' چہرے کی معصومیت اور لہجے کی پاکیزگی بتاتی ہے کہ وہ ایک ان چھوئی کلی ہے۔ کمال! اگر تم حامی سے محبت کرتے ہو تو اس پر اعتماد کرو۔ ورنہ..... ورنہ اسے دل سے نکال دو۔"

"یہی تو مشکل ہے صفدر کہ وہ دل سے نکلنے والی ہستی نہیں ہے۔ میں..... میں اس پر اعتماد کرتا ہوں۔ مگر آج ایک بات کا کھٹکا پیدا ہو گیا ہے۔"

"کون سی بات؟"

"یہی کہ میری ہنستی بستی ازدواجی زندگی کے دوران اگر کوئی اس کا طلب گار پیدا ہو گیا تو کیا ہو گا؟"

صفدر نے اس کی طرف سے رخ پھیر لیا پھر اپنے تھراتے ہوئے جذبوں پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

"کوئی...... کوئی طلبگار یہاں نہیں آئے گا۔ یہ وہم دل سے نکال دو۔ اب..... تم دونوں..... مذہب اور قانون کی رو سے میاں بیوی ہو۔ جاؤ کمال! میں ایک بگڑے ہوئے نصیب کا آدمی ہوں مگر اپنے جیتے جی تمہارے نصیبوں کو بگڑنے نہیں دوں گا۔"

کمال نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"ناکامی کا زہر کتنا تلخ ہوتا ہے' یہ تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔ اسی لئے تم مجھے حوصلہ دے رہے ہو۔ خدا کی قسم' تمہاری باتیں سن کر مجھ میں ایک نیا حوصلہ پیدا ہو گیا ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ حامی میری اور صرف میری ہے۔"

"آؤ صفدر۔ چلو اب سو جاؤ۔ رات کے تین بج چکے ہیں۔"

صفدر سر جھکا کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ کمال اپنے کمرے میں آیا اور خالی پلنگ کو حسرت سے دیکھنے لگا۔ آج کی رات کہاں گزرنی تھی اور کہاں گزر رہی تھی۔

وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بستر پر لیٹ گیا پھر اس نے ایک ملائم تکئے کو اپنے بازوؤں میں بھینچ کر آنکھیں بند کر لیں۔

رات کسی طرح گزر ہی گئی۔

دوسری صبح کمال کا ذہن نیند سے ہولے ہولے بیدار ہونے لگا۔ ابھی آنکھیں بند ہی تھیں کہ اسے اپنی سانسوں میں خوشبو سی محسوس ہونے لگی۔ پھر ایک مترنم سی آواز سنائی دی۔

"اٹھئے....... اٹھئے نا!"

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کے سامنے حامی بیڈ ٹی لئے کھڑی تھی۔

"تم!" اس نے حیرت سے پوچھا۔ پھر اس کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لیتے ہوئے کہا۔ "تم نے کیوں تکلیف کی؟"

حامی سر جھکا کر ایک لمحے تک خاموش رہی پھر ہولے سے بولی۔

"میں نہیں جانتی کہ اپنی یادداشت کھو دینے کے بعد اس گھر میں میری کیا حیثیت رہ گئی ہے لیکن اتنا جانتی ہوں کہ حیثیت کچھ بھی ہو۔ آپ کی خدمت کرنا میرا فرض بھی ہے اور ایمان بھی۔"

کمال نے خوش ہو کر اسے دیکھا۔

"حامی! تم صرف خوبصورت ہی نہیں' خوب سیرت بھی ہو۔ تمہیں پا کر میں نے سب کچھ پالیا ہے۔ آؤ بیٹھو!"

اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھالیا۔

حامی نے کہا۔

"آپ جلدی سے چائے پی کر تیار ہو جائیے۔ خالہ جان اور صفدر صاحب ناشتہ کے لیے انتظار کر رہے ہیں۔"

وہ چائے پینے لگا۔ حامی کچھ سوچتی رہی پھر وہ بولی۔

"ایک بات پوچھوں؟"

"ہاں' ہاں ضرور پوچھو۔"

"یہ...... صفدر صاحب ہمیشہ اداس کیوں رہتے ہیں؟"

کمال نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا۔

"اس نے کسی لڑکی سے محبت کی تھی مگر لڑکی اسے دھوکہ دے کر چلی گئی۔"

"کون تھی وہ؟" حامی نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"میں نے اسے نہیں دیکھا۔ صفدر کہتا تھا کہ وہ بالکل تمہارے جیسی تھی۔ اس کا نام بھی حامی......"

وہ کہتے کہتے اچانک رک گیا۔ حامی نے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

حامی کے سوال کو وہ سن نہ سکا۔ اس کے ذہن میں بہت سے الجھے ہوئے سوالات ابھر رہے تھے۔ کمال کو یاد آ رہا تھا کہ صفدر کی محبوبہ بھی اسی محلے میں رہتی تھی۔ جس محلے سے وہ حامی کو بیاہ کر لایا تھا۔ پھر اس نے اپنی محبوبہ کا نام بھی حامی بتایا تھا۔ چلو یہ دونوں باتیں اتفاق سے ایک ہو گئیں لیکن کل رات حامی بھی یہی کہہ رہی تھی کہ صفدر کو دیکھ کر اسے یہی محسوس ہوا تھا کہ اس نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔

وہ حامی کو گہری نظروں سے دیکھنے لگا۔ حامی نے پوچھا۔

"آپ باتیں کرتے کرتے رک کیوں گئے؟"

"آں..... کچھ نہیں۔ میں اس عجیب اتفاق پر غور کر رہا تھا کہ اس کی محبوبہ کا نام بھی حامی تھا۔"

"ایسے اتفاقات تو ہوتے ہی ہیں۔ کتنی ہی لڑکیوں کا نام حمیدہ بیگم اور حامی ہو سکتا ہے۔ البتہ مجھے اس بات کا دکھ ہے کہ میرے ہی نام کی ایک لڑکی دھوکے باز نکلی۔"

"ارے نہیں' تم ایسا کیوں سوچتی ہو۔" کمال نے اسے چائے کی پیالی واپس کرتے ہوئے کہا۔ "وہ اگر ایسی نکل گئی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حامی نام کی تمام لڑکیاں بھی ویسی ہی ہوں گی۔ تم یہاں بیٹھو۔ میں ابھی تیار ہو کر آتا ہوں۔"

وہ اٹھ کر باتھ روم کی طرف چلا گیا۔

شیو کرنے کے دوران' پھر غسل کرتے ہوئے اور کپڑے بدلتے وقت بھی اس کے ذہن میں ایک پھانس چبھی ہوئی تھی کہ اپنی یادداشت کھونے والی حامی کے لیے صفدر اجنبی ہوتے ہوئے بھی اجنبی نہیں تھا۔ وہ اسے پہچاننے کی ناکام کوشش کر کے گئی تھی۔

اگر یہ سچ ہے کہ صفدر حامی کو جانتا ہے تو پھر اس نے یہ بات کیوں چھپائی ہے؟"

"نہیں!" کمال نے سوچا۔ "وہ میرا ایک ایسا دوست ہے جو کبھی مجھ سے اپنی کوئی

بات نہیں چھپاتا ہے۔ میں بھی کیسی بے تکی باتیں سوچ رہا ہوں۔"

وہ مسکرانے لگا۔ ذہن میں چبھی ہوئی پھانس نکل گئی۔

وہ باتھ روم سے باہر آیا تو حامی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"چلئے' بڑی دیر ہو گئی۔ امی اور ابا بھی آتے ہوں گے۔"

"آؤ چلو۔ میں بالکل تیار ہوں۔"

اس نے حامی کا ہاتھ تھام لیا۔

پھر دونوں مسکراتے ہوئے کمرے سے باہر آئے اور اوپری برآمدے پر ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے چلنے لگے۔

"اب ہاتھ چھوڑ دیجئے۔" حامی نے التجا کی۔

"کیوں؟" اس نے پوچھا۔

"نیچے ڈرائنگ روم میں خالہ جان ہیں۔ وہ دیکھیں گی تو کیا کہیں گی؟"

"اچھا' اچھا!" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

لیکن پھر اس کی ہنسی اچانک رک گئی۔ نیچے ڈرائنگ روم میں ایک پولیس انسپکٹر دو سپاہیوں کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ زبیدہ خاتون' صفدر' منیجر اور دوسرے ملازم بھی موجود تھے۔

حامی بھی حیرت سے انہیں دیکھتی ہوئی آہستہ آہستہ کمال کے ساتھ زینے سے اترنے لگی۔ تمام لوگوں کے چہرے اداس نظر آ رہے تھے۔ زبیدہ خاتون نے آگے بڑھ کر حامی کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ کر بڑی محبت سے کہا۔

"میری بچی! میں ایک بہت بری خبر سنانا چاہتی ہوں۔ تم حوصلہ سے کام لو گی؟"

حامی نے گھبرا کر پوچھا۔

"آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

زبیدہ خاتون نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"تمہاری امی اور ابا...... اللہ کو پیارے ہو گئے۔"

"نہیں!" حامی نے چیخ کر کہا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ نہیں مر سکتے۔ وہ نہیں مر سکتے۔"

انسپکٹر نے آگے بڑھ کر کہا۔

"یہ سچ ہے محترمہ! انہیں زہر دے کر مارا گیا ہے۔ ہم اسی سلسلے میں تفتیش کرنے یہاں آئے ہیں۔"

حامی' زبیدہ خاتون سے لپٹ کر رونے لگی۔

صفدر اسے دکھ بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ رو رو کر کہہ رہی تھی۔

"ہائے خالہ جان! میں کتنی بدنصیب ہوں۔ اب میرا اس دنیا میں کون ہے۔ میں کسی کو پہچانتی بھی نہیں ہوں۔ ایک ماں باپ کا رشتہ تھا' وہ بھی ٹوٹ گیا۔ میں امی اور ابا کے پاس جاؤں گی۔ مجھے وہاں لے چلئے خالہ جان!"

"ہاں' بیٹا! صبر کرو۔ ہم ابھی چلتے ہیں۔"

"سوری میڈم!" انسپکٹر نے کہا۔ "لاشیں پوسٹ مارٹم کے لیے گئے ہیں۔ شام سے پہلے آپ انہیں حاصل کر سکتے ہیں۔ فی الحال میں آپ لوگوں کے بیانات لینے آیا ہوں۔ آپ لوگ ان کے متعلق جو کچھ بھی جانتے ہیں' وہ ہمیں بتائیں۔ تاکہ ان کی موت کی صحیح وجہ معلوم ہو سکے۔"

زبیدہ خاتون' حامی اور کمال ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ وہ ماموں اور ممانی کے متعلق بھلا کیا بتا سکتے تھے۔ وہ تو انہیں جانتے ہوئے بھی نہیں جانتے تھے۔ صرف صفدر ان کی اصلیت کو جانتا تھا' لیکن انہیں بتا نہیں سکتا تھا۔ اگر کچھ بتاتا تو اس کی اور حامی کی محبت کا راز فاش ہو جاتا۔

آخر زبیدہ خاتون نے کہا۔

"انسپکٹر صاحب! ہم ان کے متعلق صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ وہ سیلاب زدہ علاقے سے آئے تھے۔ ہمیں ان کی شرافت نے متاثر کیا تھا کہ ہم ان کی بیٹی کو بہو بنا کر لے آئے۔ یہ بیچاری بھی اس سلسلہ میں معلومات فراہم نہیں کر سکتی کیونکہ یہ اپنی یادداشت کھو چکی ہے۔"

"ہم!" انسپکٹر نے حامی کو گھورتے ہوئے کہا۔ "کوئی ڈاکٹر سرٹی فائی کر سکتا ہے کہ یہ واقعی اپنی یادداشت کھو چکی ہیں؟"

صفدر کو اچانک احساس ہوا کہ معاملات الجھ رہے ہیں۔ اگر اس نے زبان نہ کھولی

تو حامی قانون کی گرفت میں آسکتی ہے لیکن وہ کیسے کہے؟ کیا نہ کہے؟ دوست کے لیے دی ہوئی پیار کی قربانی اس کی ایک بات سے رائیگاں جاسکتی تھی۔

پھر اچانک دروازے پر سے ڈاکٹر کی آواز آئی۔

"جی ہاں! میں اس بات کی ضمانت دیتا ہوں۔ میں نے پچھلی رات مریضہ کا معائنہ کیا ہے۔ ان کی پچھلی زندگی کا ایک اہم مگر نامعلوم واقعہ ایسا ہے جس کی وجہ سے ان پر دورے پڑتے ہیں اور یہ اپنے ماضی کی طرف بھٹکتے بھٹکتے بیہوش ہو جاتی ہے۔" یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر ان کے قریب آنے لگا۔

صفدر اطمینان کا سانس لے کر صوفہ پر بیٹھ گیا۔

☆------------☆------------☆
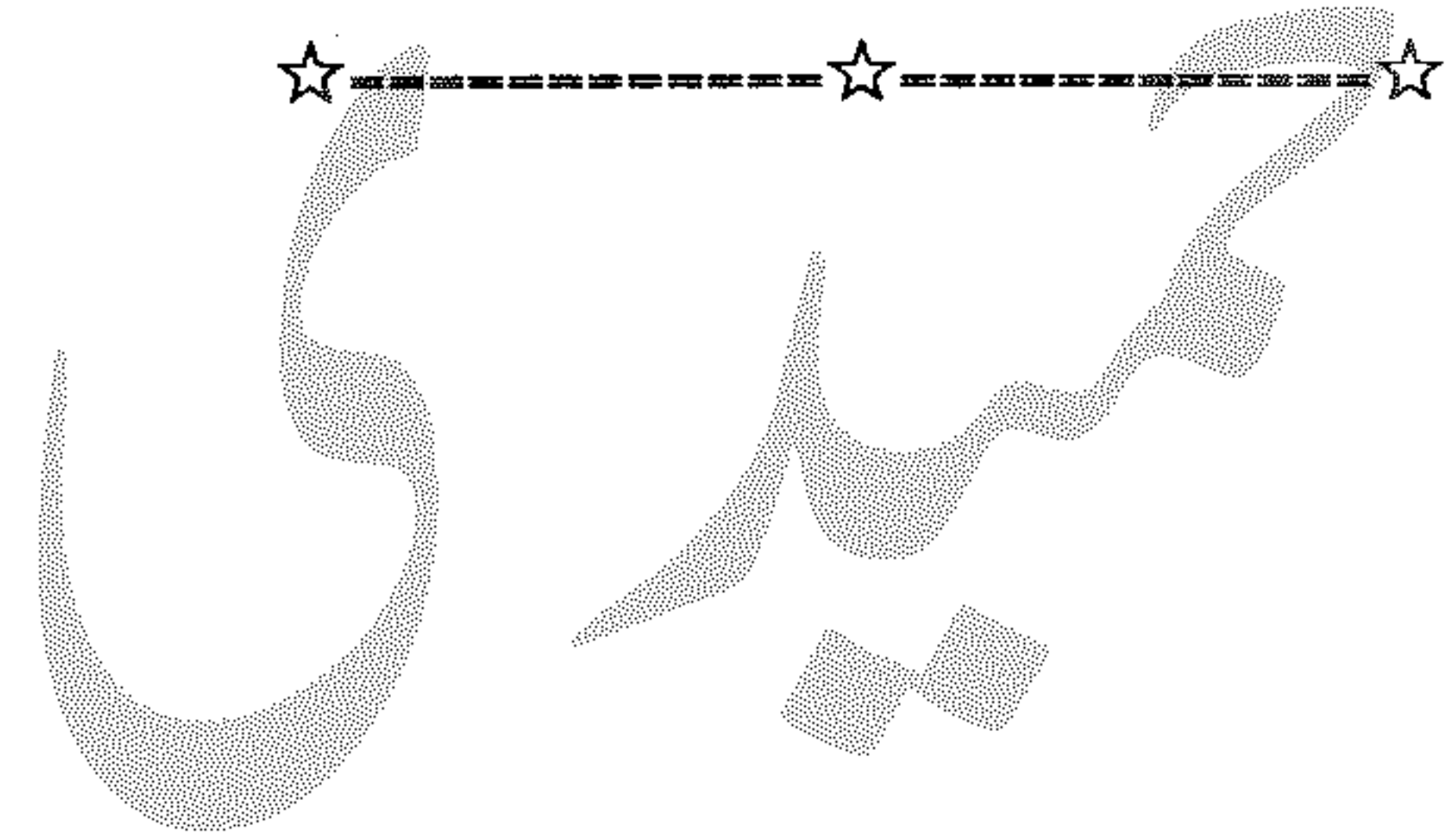
یوسف نے شیو بنوا کر آئینے میں اپنی شکل دیکھی اور مسکرانے لگا۔ پھر وہ باربر کو پیسے ادا کر کے سیلون سے باہر آیا۔ سیلون کے اوپر ایک رہائشی ہوٹل تھا' جہاں وہ پچھلی رات کو ٹھہرا ہوا تھا۔ اس وقت اس کے جسم پر بہترین سوٹ تھا۔ پیروں میں نئے جوتے اور کلائی میں ایک قیمتی گھڑی بندھی ہوئی تھی۔ وہ تیس ہزار روپے کے نشے میں جھومتا ہوا ہوٹل میں داخل ہوگیا۔ ہوٹل کے بڑے ہال کو عبور کر کے وہ زینے طے کرتا ہوا اوپری منزل پر آیا اور پانچ نمبر کے کمرے میں داخل ہوگیا۔

پانچ نمبر کا دروازہ تھوڑی دیر تک بند رہا پھر جب دوبارہ کھلا تو وہ چمڑے کا ایک بیگ تھامے باہر آیا۔ خوشی سے جھومتا ہوا' سیٹی بجاتا ہوا وہ زینے کے اوپری حصے تک پہنچ گیا۔ پھر یک بیک اس کی سیٹی کی آواز گھٹ کر رہ گئی۔ نیچے ہال کی طرف دیکھتے ہی وہ اچھل کر یوں ایک قدم پیچھے چلا گیا جیسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ اس کی زبان سے بے اختیار نکلا۔

"شوکت؟"

آخری زینے پر شوکت کھڑا ہوا تھا۔ اس نے غرا کر کہا۔

"ہاں شوکت۔ تم سمجھ رہے تھے کہ میں مرچکا ہوں۔ اچھی طرح آنکھیں پھاڑ کر دیکھو۔ میں دوبارہ زندہ ہو کر تمہاری مکاریوں کا حساب چکانے آگیا ہوں۔"

وہ ایک ایک قدم اٹھاتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ یوسف نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

"تم ناحق مجھے الزام دے رہے ہو۔ اس بوڑھے اور بڑھیا نے تمہیں زہر دیا تھا۔"

وہ زینے پر پاؤں پٹختے ہوئے آگے بڑھا۔

"میں ان سے بھی سمجھ لوں گا۔ تم اپنی سلامتی چاہتے ہو تو بتاؤ۔ حامی کہاں ہے؟"

"مم...... میں نہیں جانتا۔"

یہ کہتے ہی وہ اوپری برآمدے کی دوسری طرف بھاگا۔ شوکت بھی تیزی سے زینے طے کرتا ہوا اوپری برآمدے میں آیا۔ اس وقت تک یوسف دوسرے کاریڈور کی طرف گھوم کر نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ شوکت بھاگتا ہوا وہاں پہنچا۔ کاریڈور کے آخری سرے پر ایک زینہ نیچے کی طرف گیا تھا۔ وہ زینے پھلانگتا ہوا ہوٹل کے باہر فٹ پاتھ پر آ گیا۔

دور چند گز کے فاصلے پر یوسف ایک ٹیکسی میں بیٹھ رہا تھا۔ وہ تیزی سے اس طرف دوڑا مگر اس کے پہنچنے سے پہلے ہی ٹیکسی اس کی پہنچ سے دور ہوتی چلی گئی۔

وہ بڑی توجہ سے دور جانے والی ٹیکسی کا نمبر اپنے ذہن میں محفوظ کرنے لگا۔ پھر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ کوئی دوسری ٹیکسی خالی نہیں تھی۔ سڑک کی دوسری طرف ایک مسافر ٹیکسی سے اتر رہا تھا۔ وہ سڑک کو پار کرتے ہوئے دوسری طرف آیا اور پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔

"ٹیکسی واپس موڑو۔ ذرا جلدی......"

ٹیکسی اسٹارٹ ہوئی اور ایک یوٹرن لے کر اس طرف بھاگنے لگی جس طرف یوسف گیا تھا۔ شوکت نے کہا۔

"دیکھو' میرا ایک عزیز ایک ٹیکسی میں اسی راستہ پر گیا ہے۔ میں اسے آواز نہ دے سکا اور وہ آگے نکل گیا۔ تم اس ٹیکسی تک پہنچنے کی کوشش کرو۔"

ڈرائیور نے رفتار بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"کتنی دیر ہوئی ہے؟"

"یہی کوئی زیادہ سے زیادہ تین منٹ۔"

"پھر تو بہت دیر ہو گئی ہے صاحب! تین منٹ میں ٹیکسی کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے۔ پھر بھی کوشش کرتا ہوں۔"

وہ رفتار بڑھا کر دوسری گاڑیوں کو اوور ٹیک کرتا چلا گیا۔

"صاحب! بہت سی ٹیکسیاں پیچھے رہ گئیں۔ آپ اس ٹیکسی کو پہچان سکتے ہیں۔"

"ہاں مجھے ٹیکسی کا نمبر یاد ہے۔ پی ایل دو آٹھ چھ دس۔"

آگے جا کر ڈرائیور نے کہا۔

"صاحب! آگے راستہ تین طرف کو گیا ہے۔ کس طرف چلوں؟"

شوکت الجھن میں پڑ گیا پھر اس نے اندازے سے کہا۔

"بائیں طرف چلو!"

آگے جا کر ٹیکسی بائیں طرف مڑ گئی۔ اس راستے پر زیادہ ٹریفک نہیں تھی۔ شوکت کو دور دور تک ٹیکسی نظر نہیں آئی۔

"ٹیکسی واپس موڑ لو۔ ہم غلط راستے پر آ گئے ہیں۔"

ڈرائیور نے ٹیکسی روکی اور اسے واپس موڑتے ہوئے بولا۔

"ایسے تو آپ اپنے عزیز سے نہیں مل سکیں گے۔"

"لیکن اس سے ملنا بہت ضروری ہے۔"

ڈرائیور ٹیکسی بڑھاتے ہوئے بولا۔

"ایسا کریں صاحب کہ آگے دو راستوں میں جہاں جہاں ٹیکسی کا اڈہ ہے وہاں پی ایل دو آٹھ چھ دس کو تلاش کریں۔ وہ سواری چھوڑ کر ضرور اڈے میں آئے گا۔"

"ہاں' یہی ایک راستہ رہ گیا ہے۔"

ٹیکسی مختلف اڈوں سے ہو کر گزرنے لگی۔ ایک اڈے پر پتہ چلا کہ اس نمبر کی ٹیکسی پندرہ بیس منٹ پہلے وہاں سے گزری ہے۔

اس کی تلاش میں مزید پندرہ منٹ اور لگ گئے۔ یعنی کل پون گھنٹے کے بعد ایک اڈے میں وہ ٹیکسی کھڑی ہوئی مل گئی۔

شوکت اپنی ٹیکسی سے اتر کر اس ٹیکسی کے ڈرائیور کے پاس آیا۔

"دیکھو۔ ابھی کچھ دیر پہلے تم ایک سواری لے کر گئے تھے۔ اسے تم نے کہاں چھوڑا ہے؟"

"صاحب! آدھ گھنٹہ میں دو سواری کو بھگت چکا ہوں۔ آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟"

"وہ جو سوٹ پہنے ہوئے ایک صاحب تھے۔ ہاتھ میں چمڑے کا بیگ تھا۔"

"اوہ اچھا۔ انہیں تو میں گلبرگ کی ایک کوٹھی میں چھوڑ کر آیا ہوں۔"

"کوٹھی کا نمبر یاد ہے؟"

"صاحب! میں کوئی تھانے والا تو نہیں ہوں کہ ہر سواری کا نام نمبر یاد رکھوں گا۔ آخر بات کیا ہے؟"

"بات کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ میرے ایک عزیز ہیں۔ تم مجھے وہاں تک پہنچا دو۔"

"چلئے' وہ آپ کے عزیز ہوں یا نہ ہوں۔ اپنا تو میٹر چلنا چاہیے۔"

شوکت پہلی ٹیکسی کا کرایہ ادا کر کے دوسری ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

☆☆☆

منیجر انیکسی کے ایک کمرے میں کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور ایک انگلش میگزین کی ورق گردانی کر رہا تھا۔

اسی وقت دروازے پر سے آواز آئی۔

"آداب ڈیڈی!"

وہ چونک کر کھڑا ہو گیا۔

"تم؟"

دروازے پر یوسف کھڑا ہوا تھا۔ منیجر نے ناگواری سے پوچھا۔

"آج تمہیں باپ کی یاد کیسے آ گئی؟"

"اوہ ڈیڈی! آپ تو مجھ سے ہمیشہ ناراض رہتے ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے قریب آیا اور چمڑے کے بیگ کو پلنگ پر رکھتے ہوئے بولا۔ "ممی! زندہ ہوتیں تو مجھے دیکھتے ہی گلے لگا لیتیں۔"

"مطلب کی بات کرو۔" منیجر نے کہا۔ "کیا پچھلے روپے ختم ہو چکے ہیں کہ اب پھر مجھ سے مانگنے آئے ہو؟"

"ڈیڈی' جوان بیٹے مانگتے نہیں بلکہ دیتے ہیں۔ پچھلی بار میں آپ سے پانچ ہزار لے کر گیا تھا۔ اب اس کے پچاس ہزار بنا چکا ہوں۔ بیس ہزار پنڈی کے ایک بینک میں ہیں' دو ہزار میری جیب میں اور اٹھائیس ہزار اس بیگ میں ہیں۔"

منیجر حیرت سے بیگ کو دیکھنے لگا۔ یوسف نے بیگ کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

منیجر نے بیٹے کو مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم دھندا کیا کرتے ہو؟"

"ڈیڈی! میں نے تو کبھی یہ نہیں پوچھا کہ آپ فیکٹری میں کس طرح منیجری کرتے ہیں؟"

منیجر نے ڈانٹ کر کہا۔

"میری بات کا جواب دو۔ میں تمہاری طرح بے ایمان نہیں ہوں۔ یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ بے ایمانی سے دو مہینے میں پانچ ہزار سے پچاس ہزار تو بن سکتے ہیں مگر ایمانداری سے نہیں بن سکتے۔"

"دیکھئے ڈیڈی! میں دو مہینے کے بعد آپ کے پاس آیا ہوں۔ اس لئے ہم محض باپ بیٹے کی حیثیت سے ملیں تو بہتر ہے۔ کاروبار کو جہنم میں جانے دیجئے۔"

منیجر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"باپ کی حیثیت سے بھی مل کر میں تم سے یہی پوچھوں گا کہ یہ روپے تم کہاں سے لائے ہو؟ تمہاری ہر بات سے جھوٹ اور مکاری ظاہر ہوتی ہے۔ تم میری پونجی بینک میں رہنے نہیں دیتے۔ جو کچھ میں جمع کرتا ہوں' اسے مانگ کر لے جاتے ہو۔ پھر میں کیسے یقین کر لوں کہ پنڈی میں تم نے بیس ہزار جمع کر رکھے ہیں۔ نہیں بیٹے! میں تمہارا باپ ہوں۔ تمہاری رگ رگ کو پہچانتا ہوں۔ اس وقت جو کچھ بھی تمہارے پاس ہے' وہی تمہاری کل پونجی ہے اور پتہ نہیں کہ یہ پونجی تم کس کا گھر اجاڑ کر لائے ہو۔"

یوسف نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آپ باپ سے زیادہ تھانیدار بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چلئے یہی سہی۔ اگر میں آپ کو مجرم نظر آتا ہوں تو اپنے ہاتھوں سے بیٹے کو قانون کے حوالے کر دیجئے۔"

منیجر نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"میرے دل میں خدا کا خوف ہے۔ اگر کبھی تمہارا کوئی جرم ثابت ہوا تو میں بیٹے کے رشتے کا لحاظ نہیں کروں گا۔"

"بریو ڈیڈی! مجھے فخر ہے کہ میں ایک ایماندار باپ کا بیٹا ہوں۔ چلئے غصہ تھوک دیجئے۔ سیلاب اتر جائے گا تو میں آپ کو پنڈی لے جا کر بتاؤں گا کہ میں نے کتنا شاندار

آفس حاصل کیا ہے۔ امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار کرتا ہوں۔ لائسنس حاصل کرتا ہوں اور اسے کھرے داموں بیچ دیتا ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔ یہ بھی دیکھ لوں گا کہ تم کس حد تک سچ بول رہے ہو۔" منیجر کچھ نرم پڑ گیا۔

"وہ تو آپ دیکھ ہی لیں گے۔ مگر ان روپوں کو فی الحال تالے چابی میں رکھ لیجئے۔ میری زندگی کی پہلی اور بہترین کمائی ہے۔"

منیجر نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے جیب سے چابی نکالی اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لو' وہ الماری کھول کر رکھ دو۔ میں کوٹھی میں جا رہا ہوں۔ وہ بیچارے کل سے بڑے پریشان ہیں۔"

"کیوں؟" یوسف نے پوچھا۔ "ایسی کیا بات ہو گئی؟"

منیجر نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"اس گھر میں خوشی بھی آئی اور ماتم بھی ہو گیا۔ دو روز پہلے کمال صاحب کی شادی ہوئی تھی۔ جس گھر سے وہ دلہن کو لے کر آئے' کل صبح اسی گھر میں تین لاشیں پائی گئی ہیں۔"

"تین لاشیں؟" گھبراہٹ میں یوسف کے ہاتھ سے چابی گر پڑی۔

منیجر باہر جانے کے لیے اپنی چھڑی اٹھا رہا تھا۔ اس لئے بیٹے کی گھبراہٹ نہ سمجھ سکا۔ اس نے فرش پر چھڑی کو ٹیکتے ہوئے کہا۔

"ہاں' پولیس قاتل کی تلاش میں ہے۔"

"قاتل کی تلاش؟"

"ہاں' وہاں رکھے ہوئے شراب کے ایک گلاس پر انگلیوں کے جو نشانات پائے گئے ہیں وہ مقتول کی انگلیوں کے نشانات سے مختلف ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں کوئی چوتھا شخص بھی موجود تھا جو انہیں ہلاک کر کے فرار ہو گیا ہے۔"

یوسف نے اپنی کپکپاہٹ پر قابو پانے کے لیے چمڑے کے بیگ کو مضبوطی سے تھام لیا۔

منیجر اپنی بات پوری کر کے جا چکا تھا۔

یوسف دھپ سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ جہاں جاتا تھا' شامت اس کا پیچھا کرتی چلی آتی تھی۔ پنڈی سے صفدر اس کا پیچھا کرتا رہا پھر شراب پینے کے جرم میں فوجیوں نے گرفتار کر لیا۔ اسے جیل تو نہ جانا پڑا' مگر بارہ دنوں تک فوجیوں کے ساتھ ایک پل کی تعمیر کے لیے مزدوروں کی طرح کام کرنا پڑا۔ وہاں سے چھوٹ کر ماموں کے پاس آیا تو تیس ہزار روپوں نے اسے اس کی خوش قسمتی کا یقین دلایا۔ مگر یہ خوش قسمتی بھی زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ نہ جانے وہ شوکت کا بچہ کس طرح دوبارہ زندہ ہو کر آ گیا؟

یوسف اس عجوبہ پر غور کرنے لگا۔ اسے یقین ہو گیا کہ زہر دینے کے سلسلے میں کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی۔ اس نے ممانی سے پہلے ہی کہا تھا کہ ماموں کو نشے کی حالت میں زہر لانے کے لیے نہ بھیجا جائے۔ نہیں معلوم کہ وہ الو کا پٹھا ماموں زہر کے بدلے کیا اٹھا لایا تھا۔

دوسری غلطی یوسف سے ہو گئی تھی۔ اسے چاہئے تھا کہ شوکت کو کہیں دفن کر کے آتا لیکن وہ اتنی زحمت اٹھانے کی بجائے اسے ایک کھڈ میں پھینک آیا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ مردہ بھی زندہ ہو سکتا ہے۔ ورنہ وہ یہ غلطی کبھی نہ کرتا۔

وہ بے بسی سے اپنے ہونٹ چباتے ہوئے سوچ رہا تھا کیسی مصیبت پر مصیبت آ رہی تھی۔ شوکت سے پیچھا چھڑا کر یہاں آیا تو معلوم ہوا کہ پولیس اس کی تلاش میں ہے۔ بہرحال اب بھی کچھ نہیں بگڑا تھا۔ پولیس مجرم کو اس کے چہرے سے نہیں پہچانتی تھی۔ انگلیوں کے نشانات سے اس تک پہنچنا ایک مشکل کام تھا۔

اس نے اطمینان کی ایک سانس لی۔

ذرا اطمینان ہوا تو اسے خیال آیا کہ تین لاشوں کا تعلق اس کوٹھی سے ہے یعنی حامی اس جگہ بیاہ کر آئی ہے۔

اس خیال کے آتے ہی وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کھڑکی کے قریب آ کر کوٹھی کی طرف دیکھنے لگا۔

کوٹھی کے پورچ کی طرف دیکھتے ہی پھر اس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہاں صرف حامی ہی نہیں بلکہ کوٹھی کے دوسرے افراد کے ساتھ صفدر بھی کھڑا ہوا تھا۔ وہ

حیران تھا کہ حامی کی شادی تو کمال سے ہو چکی ہے' پھر صفدر اپنی محبوبہ کو پرائی دلہن کے روپ میں کیسے برداشت کر رہا ہے؟ پنڈی سے لاہور کے سفر میں وہ اس لڑکی کا دیوانہ تھا۔ اب کیا اس کی دیوانگی ختم ہو گئی ہے یا وہ کمال کی دولت سے بک گیا ہے؟

بہت سے سوالات اس کے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔

حامی کار کی پچھلی سیٹ پر زبیدہ خاتون کے ساتھ بیٹھ رہی تھی اور منیجر ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر آ گیا تھا پھر کار اسٹارٹ ہو کر آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ صفدر اور کمال جاتی ہوئی کار کو دیکھتے رہے۔

انیکسی کے سامنے سے گزرنے والی کار کو یوسف بھی دیکھتا رہا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ کار میں بیٹھی ہوئی حامی کو غور سے دیکھتا رہا۔ سوگواری میں اس کا حسن اور بھی جان لیوا ہو گیا تھا۔ یوسف کے سینے میں دل مچل کر رہ گیا۔

یہ ذرا دیر کا دل آفریں جلوہ تھا۔ دوسرے لمحے پھر یوسف کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں کیونکہ جیسے ہی کار مین گیٹ سے باہر نکل کر مڑی' اسی موڑ پر شوکت نظر آ گیا۔

شوکت بھی حیرت اور خوشی سے کار کی جانب دیکھ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس نے کار میں بیٹھی ہوئی حامی کو دیکھ لیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ حامی اسے دیکھ کر خوشی سے پاگل ہو جائے گی لیکن اس وقت تک کار دوسری طرف مڑ کر چلی گئی تھی۔

وہ تھوڑی دیر تک کھڑا دور جاتی ہوئی کار کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے پلٹ کر پورچ کی جانب دیکھا۔ صفدر اور کمال باتیں کرتے ہوئے کوٹھی کے اندر جا رہے تھے۔ شوکت ٹیکسی کا کرایہ ادا کر کے مین گیٹ کی طرف آنے لگا۔

یوسف جلدی سے کھڑکی کے پردے کی آڑ میں ہو گیا۔ شوکت آہستہ آہستہ چلتا ہوا انیکسی کے سامنے آ کر رک گیا اور اس کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ یوسف کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اسے باپ کے جاتے ہی دروازہ بند کر دینا چاہئے تھا۔ اف! اس نے سوچا۔ یہ شوکت واقعی قبر سے اٹھا ہوا مردہ ہے۔ کسی بدروح کی طرح یہاں تک پہنچ گیا ہے۔

لیکن پھر شوکت انیکسی کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گیا اور کوٹھی کی طرف جانے

صفدر اور کمال باتیں کرتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ کمال نے بڑی اداسی سے کہا۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ حامی کا دل کس طرح بہلایا جائے۔ وہ بہت اداس رہتی ہے۔"

صفدر نے جواب دیا۔

"اس سے زیادہ تو تم منہ لٹکائے رہتے ہو۔ بھئی حامی کی فکر نہ کرو اپنے والدین کی موت پر اس کا اداس ہونا فطری بات ہے۔ آہستہ آہستہ وہ ہنسنے بولنے لگے گی۔"

کمال نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"جیسی میری شادی ہوئی ہے' شاید ایسی کسی کی نہ ہوئی ہوگی۔ سہاگ رات ویسے ہی ضائع گئی۔ دوسری صبح حامی کی محبت اور خدمت دیکھ کر یقین ہوا کہ اب ازدواجی خوشیاں نصیب ہوں گی مگر اس کے والدین کی موت نے اس خانہ آبادی کو ماتم کدہ بنا دیا ہے۔ نہ جانے اب یہ سوگ کب تک منایا جائے گا۔ ویسے صفدر! میں ایک عجیب سی بات سوچ رہا ہوں۔"

"وہ کیا؟"

"میں سوچ رہا تھا کہ شاید حامی کسی کی امانت ہے۔ اسی لئے قدرت اسے مجھ سے دور رکھ رہی ہے۔"

"آں!" صفدر گڑبڑا گیا پھر اس نے سنبھل کر کہا۔ "تم بھی عجیب الٹی سیدھی باتیں

لگا۔

یوسف نے اطمینان کی سانس لی۔ ویسے اب وہ سوچ رہا تھا کہ یہاں سے بھی فی الحال فرار ہو جانا چاہیئے۔ کیونکہ دشمن نے اس کی پناہ گاہ دیکھ لی ہے۔

☆------------☆------------☆

سوچتے رہتے ہو۔ وہ تمہاری شریکِ حیات ہے۔ پھر بھلا وہ کس کی امانت ہو سکتی ہے؟"

اس کی بات پوری ہوتے ہی کال بیل کی آواز سنائی دی۔

دور کھڑا ہوا ملازم بیل کی آواز سنتے ہی ڈرائنگ روم سے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آ کر اس نے کہا۔

"صاحب! کوئی شوکت صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں؟"

"شوکت!" کمال نے کہا۔ "اس نام کا کوئی آدمی میرا شناسا نہیں ہے۔ صفدر! کہیں تمہارا کوئی ملنے والا نہ ہو؟"

صفدر نے سوچتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھئی' میں بھی کسی شوکت سے واقف نہیں ہوں۔ یار کوئی سیلاب زدہ لوگوں کے لیے چندہ مانگنے آیا ہوگا۔"

پھر اس نے ملازم سے کہا۔

"جاؤ کہہ دو کہ کمال صاحب ابھی کسی سے نہیں مل سکتے۔"

ملازم چلا گیا۔ کمال نے کہا۔

"یار' وزیراعظم کے سیلاب فنڈ میں ایک لاکھ روپے دے چکا ہوں۔ پھر بھی لوگ آ کر پریشان کرتے رہتے ہیں۔"

ملازم نے واپس آ کر کہا۔

"صاحب! وہ کہتے ہیں کہ آپ سے نہیں چھوٹی مالکن سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"حامی سے؟" کمال اور صفدر چونک کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

کمال نے لرزتی ہوئی آواز میں صفدر سے پوچھا۔

"کیا...... کیا حامی کو جاننے والا کوئی آ گیا ہے؟"

صفدر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ حامی کو جاننے والا یہ دوسرا شوکت کہاں سے آ گیا ہے کیونکہ حامی نے جو داستان صفدر کو سنائی تھی۔ اس کے مطابق شوکت مر چکا تھا۔

آخر صفدر نے کہا۔

"ٹھہرو' میں جا کر دیکھتا ہوں۔" وہ دروازہ کی طرف جانے لگا۔

"نہیں صفدر' رک جاؤ۔ اگر وہ حامی کو جانتا ہے تو ہمیں یہاں بیٹھ کر اس سے

تفصیلی گفتگو کرنا چاہئے۔"

پھر اس نے ملازم سے کہا۔

"جاؤ' انہیں اندر بھیج دو۔"

ملازم باہر چلا گیا۔

صفدر آنے والے کے متعلق پریشانی سے سوچنے لگا۔ کمال کی بھی یہی حالت تھی۔ اس کے دل میں صرف ایک خوف تھا کہ کوئی حامی کو اس سے چھین کر نہ لے جائے۔

"السلام علیکم!" شوکت اندر داخل ہوا۔

"آیئے!" صفدر نے کہا۔ "آپ کس سے ملنا چاہتے ہیں؟"

"حمیدہ بیگم سے۔" اس نے جواب دیا۔

کمال نے آگے بڑھ کر کہا۔

"میری وائف کا نام حمیدہ بیگم ہے۔ کیا آپ انہیں جانتے ہیں؟"

"آپ کی وائف۔" شوکت کا چہرہ بجھ سا گیا۔ اسے یہ سن کر صدمہ ہوا تھا کہ اس کی حامی پرائی ہو چکی ہے۔ اس نے کہا۔

"میں جس حامی کو جانتا ہوں' اسے میں نے ابھی کار میں بیٹھ کر جاتے دیکھا ہے۔ اگر وہ آپ کی شریکِ حیات بن چکی ہے تو پھر یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ وہ آپ جیسے شریف آدمی کی پناہ میں آگئی ہے۔ دراصل میں ایک بدمعاش کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک اتفاق سے آگیا ہوں۔"

"بدمعاش کا پیچھا؟"

"ہاں! وہ بہت ہی کمینہ آدمی ہے۔ وہ حامی کی زندگی برباد کرنا چاہتا تھا۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ وہ اسی کوٹھی میں آیا ہے۔"

"اس کوٹھی میں؟" صفدر اور کمال ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ پھر کمال نے پوچھا۔ "یہ کتنی دیر کی بات ہے؟"

"تقریباً ایک گھنٹہ پہلے کی بات ہے۔ میں نے لاہور ہوٹل سے اس کا پیچھا کیا تھا۔ جس ٹیکسی میں وہ فرار ہوا تھا' اسی ٹیکسی والے نے مجھے بتایا ہے کہ وہ اسی کوٹھی میں آیا ہے۔ پھر یہاں آکر میں نے حامی کو دیکھا تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ بدمعاش اس مظلوم لڑکی کا

اب تک پیچھا کر رہا ہے۔"

"تعجب ہے!" کمال نے کہا۔ "اس کوٹھی میں صبح سے اب تک کوئی اجنبی نہیں آیا ہے۔"

صفدر اس وقت کچھ اور ہی سوچ رہا تھا اور شوکت کو پریشانی سے دیکھ رہا تھا کہ حامی کا یہ ہمدرد کہاں سے پیدا ہو گیا ہے؟ اس کی باتوں سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ حامی کو بہت عرصہ سے جانتا ہے۔ صرف حامی کو ہی نہیں اس کے دشمن کو بھی پہچانتا ہے۔

کمال نے ملازم سے کہا۔

"تم انیکسی میں جا کر دیکھو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ بدمعاش وہاں آکر چھپا ہو۔"

صفدر نے شوکت سے پوچھا۔

"آپ اس بدمعاش کا نام جانتے ہیں؟"

"جی ہاں! اس کا نام یوسف ہے۔"

صفدر کو جیسے بجلی کا شاک پہنچا ہو۔ یوسف' یہ آنے والا اجنبی یوسف کو حامی کے دشمن کی حیثیت سے پہچانتا تھا۔ اس نے سوچا' کہیں یہ اجنبی یہ بھی نہ جانتا ہو کہ حامی پنڈی سے آئی ہے۔

صفدر مزید سوالات سے پرہیز کرنے لگا۔

کمال نے شوکت سے کہا۔

"آیئے تشریف رکھئے۔ آپ کی باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ آپ میری وائف کی ابتدائی زندگی کے متعلق بہت کچھ جانتے ہیں۔ کیا آپ مجھے ان کے متعلق بتا سکتے ہیں؟"

شوکت نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تعجب ہے آپ اپنی وائف کی ابتدائی زندگی کے متعلق مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔"

"ہاں!" کمال نے کہا۔ "بظاہر یہ تعجب کی بات ہے لیکن میں حامی سے کچھ بھی معلوم نہیں کر سکتا کیونکہ وہ اپنی یادداشت کھو چکی ہے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" شوکت حیرت سے کھڑا ہو گیا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ آج سے یہی کوئی بیس دن پہلے وہ اپنا ماضی بھول گئی

ہے۔"

شوکت نے کہا۔

"اگر وہ اپنے آپ کو بھول گئی ہے تو اس کے ماموں اور ممانی تو اس کے متعلق جانتے ہیں۔"

صفدر کا دماغ چکرانے لگا۔ کمال نے کہا۔

"حامی کے والدین کے سوا ہم اس کے کسی ماموں اور ممانی کو نہیں جانتے ہیں۔"

شوکت نے پریشان ہو کر کہا۔

"میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ حامی کے والدین تو اس کے بچپن میں مرگئے تھے۔ پھر آپ انہیں کس طرح جانتے ہیں؟"

کمال نے جواب دیا۔

"بچپن میں نہیں بلکہ آج سے دو دن پہلے ان کا قتل ہوا ہے۔"

"قتل؟" شوکت نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں!" کمال نے کہا۔ "آپ کسی اور حمیدہ بیگم کے دھوکے میں یہاں چلے آئے ہیں۔"

صفدر نے جلدی سے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ ہمارے ہاں جو حمیدہ بیگم ہیں' انہیں یتیم ہوئے صرف دو دن گزرے ہیں اور مسٹر شوکت جس کی تلاش میں ہیں' وہ بچپن سے یتیم تھی۔"

اسی وقت ملازم نے آکر کہا۔

"صاحب! انیکسی میں کوئی بھی نہیں ہے۔"

صفدر نے شوکت سے کہا۔

"دیکھ لیجئے۔ یہاں کوئی بدمعاش بھی نہیں آیا ہے۔ آپ اس کا پیچھا کرتے ہوئے غلط جگہ آگئے ہیں۔"

شوکت نے جواب دیا۔

"آپ کی یہ بات میں مان سکتا ہوں کہ ٹیکسی ڈرائیور مجھے غلط جگہ لے آیا ہے لیکن حامی کو یہاں میں نے بہت قریب سے اور بہت غور سے دیکھا ہے اور اسے دیکھ کر

یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ غلط جگہ پہنچ کر بھی صحیح جگہ آگیا ہوں۔ کیا اتنا عجیب اتفاق ہو سکتا ہے کہ دو لڑکیوں کی شکل بھی ایک ہو اور نام بھی ایک؟"

کمال چونک کر صفدر کو دیکھنے لگا۔ صفدر نے جھجکتے ہوئے شوکت سے کہا۔

"آپ فضول بحث کر رہے ہیں۔"

"فضول بحث کیسے؟" کمال نے کہا۔ "جس لڑکی سے تم محبت کرتے تھے' وہ بھی حامی سے ملتی جلتی تھی۔ اس کا نام بھی حامی تھا۔"

صفدر نے پریشان ہو کر کہا۔

"یار تم کہاں کی بات کہاں پہنچا رہے ہو۔ ٹھہرو' ابھی حقیقت معلوم ہوئی جاتی ہے۔ مسٹر شوکت! بیگم کمال سیالکوٹ کے ایک علاقہ ڈسکہ کی رہنے والی ہیں۔ آپ کی حمیدہ بیگم کا تعلق ڈسکہ سے ہے یا نہیں۔ صرف ہاں یا نہ میں جواب دیں۔ ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ وہ کہاں کی رہنے والی ہیں۔"

شوکت نے مایوس ہو کر کہا۔

"نہیں۔ وہ ڈسکہ کی رہنے والی نہیں ہیں۔"

صفدر نے کہا۔

"بس تو پھر بات صاف ہو گئی۔ آپ جاسکتے ہیں۔"

شوکت نے کہا۔

"مجھے احساس ہے کہ میں یہاں آکر آپ لوگوں کو پریشان کر رہا ہوں لیکن جناب علاقہ بدل جانے سے حقیقت نہیں بدل جاتی۔ اس کے علاوہ آپ اعتراف کر چکے ہیں کہ آپ اپنی وائف کی ابتدائی زندگی سے واقف نہیں ہیں پھر یہ یقین سے کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ وہ ڈسکہ کی رہنے والی ہیں۔"

کمال نے جواب دیا۔

"یہ بات اس کے والدین نے بتائی تھی مگر ہاں۔ ایک بات ضرور ہے۔ وہ بھی ہم سے کچھ چھپاتے رہے ہیں۔ انہوں نے شادی سے پہلے ہمیں یہ نہیں بتایا تھا کہ میری ہونے والی وائف اپنی یادداشت کھو چکی ہے۔"

شوکت نے چونک کر پوچھا۔

"کیا.... آپ نے اس وقت ان سے شادی کی ہے جب وہ اپنی یادداشت کھو چکی تھیں؟"

"ہاں!" کمال نے کہا۔

شوکت اچانک قہقہہ لگانے لگا۔ کمال نے بگڑ کر کہا۔

"یہ کیا بیہودگی ہے؟"

"بیہودگی نہیں مسٹر' آپ کی عقل پر ہنسی آ رہی ہے۔ جو لڑکی اپنے آپ کو نہیں پہچانتی ہے۔ اس کے ساتھ نکاح کیسے جائز ہو سکتا ہے؟"

"کیا؟" کمال گڑبڑا گیا۔

"تم بکواس کرتے ہو۔" صفدر نے بگڑ کر کہا۔

شوکت نے جواب دیا۔

"سچائی اکثر بکواس نظر آتی ہے لیکن آپ لوگ تو دیکھنے میں تعلیم یافتہ نظر آتے ہیں۔ کیا اپنی عقل سے زندگی کے اس اہم مسئلہ پر غور نہیں کر سکتے؟ اگر نہیں کر سکتے تو کسی عالم دین سے دریافت کریں کہ جو لوگ ذہنی مریض ہوتے ہیں' ان کا نکاح قبول ہو سکتا ہے یا نہیں؟"

"مسٹر شوکت!" صفدر نے گرج کر کہا۔ "آپ اپنی قابلیت نہ جتائیں۔ بہتر ہے کہ یہاں سے چلے جائیں۔"

کمال نے صفدر کا بازو تھام کر کہا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو صفدر۔ ایک شخص اتنی ذہانت کی باتیں کر رہا ہے۔ ہمیں اس کی قدر کرنی چاہیے۔ تم خود ہی کہو' کیا یہ مسئلہ قابلِ غور نہیں ہے۔"

"میں کچھ نہیں جانتا۔" صفدر نے کہا۔ "حامی نے نکاح قبول کیا ہے اور وہ تمہاری بیوی ہے۔ اگر تم دونوں کی ازدواجی خوشیوں کو برداشت کرنے کے لیے کسی نے کوئی فلسفہ ٹھونسنے کی کوشش کی تو میں اسے برداشت نہیں کروں گا۔"

کمال نے کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ میری خوشیوں کے لئے تم قربان بھی ہو سکتے ہو لیکن صفدر! مذہب اور قانون نے دانشمندی کے جو راستے بنائے ہیں' ہمیں ان ہی راستوں پر چلنا

ہوگا۔"

"کیسے چلنا ہوگا؟" صفدر نے چیخ کر پوچھا۔ "کیا تم حامی کی محبت کو دل سے نکال سکتے ہو؟"

"آں!" وہ ہچکچانے لگا۔ "نن...... نہیں۔ محبت اور قانون کی اس الجھن میں اتنی جلدی میں نہیں کہہ سکتا کہ میرا فیصلہ کیا ہوگا۔ دل میں محبت اور دماغ میں قانون ہو تو فیصلے ڈگمگانے لگتے ہیں۔"

"ڈگمگانے دو فیصلے کو۔" صفدر نے کہا۔

شوکت نے کہا۔

"اگر فیصلہ صرف آپ لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا تو یقیناً ڈگمگا جاتا لیکن ایک حامی کی تلاش مجھے بھی ہے۔ اگر بیگم کمال کی یادداشت واپس آ جائے اور وہ مجھے پہچان لے تو مجھے اس نکاح کے خلاف آواز اٹھانے کا پورا حق حاصل ہوگا۔ کیونکہ میں اپنی گمشدہ حامی کے لیے موت کے منہ سے واپس آیا ہوں۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ زہریلے دودھ سے بھرا گلاس پی کر بھی میں زندہ رہ گیا؟"

صفدر لڑکھڑا کر صوفے پر بیٹھ گیا اور حیرت سے شوکت کو دیکھنے لگا۔ اب اسے معلوم ہوا کہ یہ وہی شوکت ہے جس نے حامی کے ہاتھوں زہریلا دودھ پیا تھا۔

کمال نے بھی شوکت کو حیرت سے دیکھ کر پوچھا۔

"تعجب ہے آپ زہر پینے کے بعد بھی کیسے بچ گئے؟"

شوکت نے ہنستے ہوئے کہا۔

"صاف ظاہر ہے کہ زہر دینے والوں سے غلطی ہو گئی۔ حامی نے سمجھا تھا کہ میں مر چکا ہوں۔ حالانکہ میں بیہوش ہو گیا تھا۔ ایسی خطرناک بے ہوشی تھی جو انسان کو موت کے قریب لے جاتی ہے۔ بہرحال ہوش میں آنے کے بعد میں نے خود کو ہسپتال میں پایا۔ ایک ماہ کے بعد صحت یاب ہو کر اپنے دشمنوں کی تلاش میں نکلا۔ ماموں کے اڈے پر جوا کھیلنے والے تمام بدمعاشوں سے پوچھ گچھ کی تو پتہ چلا کہ زہر لانے والے ماموں' دودھ میں زہر ملانے والی ممانی اور مجھے مردہ سمجھ کر ایک کھڈ میں پھینک جانے والا یوسف تھا۔

"یہ تینوں حامی کو لے کر فرار ہو گئے تھے۔ میں اپنے ایک کیمسٹ کے پاس گیا۔

جہاں سے ماموں میرے اکاؤنٹ میں دوائیں لیا کرتے تھے۔ اس سے پتہ چلا کہ ایک بار ماموں نشے کی حالت میں آئے تھے اور اس سے زہر طلب کر رہے تھے۔ کیمسٹ جانتا تھا کہ نشہ کے دوران انہیں نصیحت کرنا فضول ہے۔ لہٰذا اس نے ایک بے ضرر سفوف میں نیند کی دو گولیاں پیس کر دے دی تھیں۔ قصہ مختصر یہ کہ دشمنوں کی نالائقی سے آج میں زندہ نظر آ رہا ہوں۔"

صفدر' شوکت کو...... حامی کی پہلی محبت کو دیکھے جا رہا تھا۔ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ کمال اسے گھور کر دیکھ رہا ہے۔

پھر کمال نے شوکت سے کہا۔

"آپ کی زبان سے بار بار ماموں اور ممانی کا رشتہ سن کر مجھے بھی ایک بات یاد آ گئی ہے۔ میرا دوست صفدر جس لڑکی سے محبت کرتا تھا' اس کے سرپرست بھی ماموں اور ممانی تھے اور وہ پنڈی کے رہنے والے تھے۔"

صفدر نے گھبرا کر کمال کو دیکھا۔ شوکت نے کہا۔

"میں جس کی تلاش میں بھٹک رہا ہوں' وہ بھی پنڈی کی رہنے والی ہے۔"

صفدر اٹھ کر وہاں سے جانے لگا۔ کمال نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"رک جاؤ صفدر!"

صفدر کے قدم رک گئے۔ کمال نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"صفدر! کیا منہ چھپانے سے حقیقت چھپ جائے گی؟"

"م...... میں نے کوئی حقیقت نہیں چھپائی ہے۔" صفدر نے اس کی طرف گھوم کر کہا۔

کمال اسے گھورتے ہوئے بولا۔

"تو پھر اس بات کا اعتراف کرو کہ مسٹر شوکت جس حامی کی تلاش میں ہیں' تم اسی حامی سے محبت کرتے تھے۔"

صفدر شوکت کی طرف دیکھنے لگا۔ شوکت بھی اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا پھر صفدر نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"میرے اعتراف کرنے سے نہ مسٹر شوکت کا بھلا ہوگا اور نہ میرا۔ کیونکہ وہ حامی

گزرے ہوئے وقت کی طرح گم ہو چکی ہے۔"

شوکت نے آگے بڑھ کر صفدر سے پوچھا۔

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ حامی اور ماموں ممانی کو اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"اور اس کا مطلب یہ ہوا۔" کمال نے انگلی اٹھا کر کہا۔ "کہ مسٹر شوکت کی حامی...... تمہاری حامی...... اور میری حامی شکل ایک ہے' نام ایک ہے اور...... اور وجود ایک ہے۔"

کمال اچانک ہی دونوں ہاتھوں سے صفدر کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑنے لگا۔

"صفدر! میں نے تمہاری محبت کا چھپا ہوا چہرہ دیکھ لیا ہے۔ مجھے بتاؤ! تم نے اسے دوستی کے پردے میں کیوں چھپایا تھا۔ تم کیوں میرے جذبات سے کھیلتے رہے؟ تم نے مجھے حامی کی محبت میں اتنی دور کیوں پہنچا دیا' جہاں سے میں واپسی کے لیے بھی نہیں آ سکتا۔ کیا میں اب اپنی محبت کو بھول کر ہنستی مسکراتی زندگی گزار سکتا ہوں؟ کیا تم اپنی محبت کی قربانی دے کر مسکرا سکے تھے۔ نہیں! تم میرے سامنے مسکراتے بھی تھے تو اندر سے تڑپ تڑپ کر۔ محبت تمہیں رلاتی تھی مگر دوستی کا جذبہ تمہیں مسکرانے پر مجبور کرتا تھا۔

"دوست کی خوشیوں کے لیے محبت کی قربانی دینے والے! اگر اب مسکرا کر دکھا سکتے ہو تو دکھاؤ۔ میں بھی تمہارے لئے قربانی دے کر مسکرا سکتا ہوں لیکن یہ نہ بھولو کہ اس محبت کا تیسرا طلبگار بھی یہاں موجود ہے۔"

صفدر نے بے بسی اور التجا آمیز نظروں سے شوکت کو دیکھنے لگا۔

شوکت نے مسکرا کر کہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ میں بھٹکتے ہوئے صحیح جگہ آ گیا ہوں۔"

صفدر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"شوکت صاحب! حامی کی زبانی مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ آپ ہمیشہ اس کی عزت کی حفاظت کرتے رہے ہیں اور...... اور آپ اسے چاہتے بھی تھے لیکن آج وہ باعزت طور پر کمال جیسے شریف آدمی کی شریکِ حیات بن چکی ہے۔ اس لئے ہم دونوں کا فرض ہے کہ اس کے خیال کو اپنے اپنے دل سے نکال دیں۔"

"ہم!" شوکت نے کہا۔ "میں حقیقتاً یہی چاہتا ہوں کہ وہ جہاں رہے' عزت سے

رہے لیکن یہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ حامی نے اپنے پورے ہوش و حواس کے ساتھ کمال صاحب کو بطور خاوند قبول نہیں کیا ہے۔ اگر کبھی اس کی یادداشت واپس آ جائے اور وہ ہم دونوں کو پہچان لے تو آپ بتا سکتے ہیں کہ اس وقت حامی کا فیصلہ کیا ہوگا؟ وہ مجھے قبول کرے گی؟ یا آپ کو قبول کرے گی؟ یا کمال صاحب کو؟"

یہ سوال اتنا اہم اور ٹھوس تھا کہ صفدر اور کمال جواب دینے کی بجائے سوچتے ہی رہ گئے۔

شوکت نے مسکرا کر کہا۔

"یہ فیصلہ ہم تینوں میں سے کوئی نہیں کر سکتا۔ صرف حامی کر سکتی ہے۔ اگر ہم تینوں دیانتداری سے اس کی یادداشت کو واپس لانے کی کوشش کریں۔"

صفدر نے کہا۔

"بعض اوقات یادداشت واپس آتے آتے سالہا سال گزر جاتے ہیں۔ کیا اتنے عرصہ تک ہم حامی کو اپنے درمیان ایک تماشہ بنا کر رکھیں گے؟"

"نہیں!" کمال نے کہا۔ "ہم اپنی آرزوؤں کے لیے حامی کی خوشیوں کو برباد نہیں کر سکتے۔ اس مسئلہ کا کوئی فوری حل تلاش کرنا چاہئے۔"

صفدر نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"اس کا حل یہی ہے کہ ہم قدرت کے فیصلے کو تسلیم کر لیں۔"

شوکت نے کہا۔

"اگر قدرت کی طرف سے کوئی فیصلہ ہو جائے تو میں اسے ضرور تسلیم کروں گا۔"

"فیصلہ تو ہو چکا ہے۔" صفدر نے کہا۔ "قدرت کو یہی منظور تھا کہ حامی آپ سے اور مجھ سے بچھڑ جائے اور کمال کی شریکِ حیات بن جائے۔"

شوکت نے ہنستے ہوئے کہا۔

"واہ کیا بات کہی ہے آپ نے۔ پھر تو میں بھی یہی کہوں گا کہ قدرت نے مجھے زہریلے دودھ سے اسی لئے بچایا ہے کہ میں دوبارہ حامی سے مل سکوں اور اپنے پیار کا حق طلب کر سکوں۔ کیا آپ قدرت کے اس فیصلہ کو تسلیم نہیں کریں گے؟"

صفدر ہونٹ بھینچ کر خاموش رہ گیا۔ کمال نے کہا۔

"صفدر! تم خواہ مخواہ میری حمایت نہ کرو۔ ہم تینوں ایک ہی آگ میں جل رہے ہیں اور اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ گئے ہیں کہ اگر ہم نے ایک دوسرے کے لیے محبت کی قربانی دی تو پھر زندگی بھر پیار کی اس آگ میں اندر ہی اندر جلتے رہیں گے۔

"لہٰذا ہم تینوں کو کھلے دل سے یہ اعتراف کرنا چاہئے کہ حامی ہم تینوں کے ذہن میں نقش ہو کر رہ گئی ہے۔ جب ہم یہ اعتراف کر لیں گے تو پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ ہم تینوں میں سے کون اسے سب سے زیادہ چاہتا ہے کیونکہ جس کے دل میں حامی کی گہری محبت ہوگی۔ وہی حامی کی خوشیوں کے لیے قربانی دے گا۔"

"میں اس کے لیے قربانی دے سکتا ہوں۔" صفدر نے کہا۔

"میں بھی دے سکتا ہوں۔" شوکت نے کہا۔

"اور میں بھی۔" کمال تلخی سے مسکرا کر بولا۔

اس وقت پورچ میں کسی گاڑی کی آواز آئی۔ ملازم نے باہر سے آ کر کہا۔

"صاحب مالکن واپس آ گئی ہیں۔"

وہ تینوں دھڑکتے ہوئے دل سے دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ حامی کا انتظار کرنے لگے۔

پھر اچانک ہی کمال نے شوکت سے کہا۔

"شوکت صاحب! آپ فوراً ہی اس کمرے میں چلے جائیں۔ وہ حامی کا کمرہ ہے۔"

صفدر نے کمال سے کہا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"جو کہہ رہا ہوں' ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں۔ شوکت صاحب کو موقع دینا چاہئے کہ وہ حامی سے تنہائی میں ملیں۔"

شوکت چپ چاپ زینے طے کرتا ہوا اوپر حامی کے کمرے کی طرف جانے لگا۔

تھوڑی دیر بعد ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا۔ زبیدہ خاتون' حامی اور منیجر اندر داخل ہوئے۔ زبیدہ خاتون نے بیٹے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"کمال! منیجر صاحب ہمیں یقین دلا رہے ہیں کہ ان کا بیٹا راہ راست پر آ گیا ہے اور اب اچھا خاصا کاروبار کر رہا ہے۔"

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔" کمال نے رسمی انداز میں کہا پھر حامی سے کہا۔

"حامی تم بہت تھکی ہوئی نظر آ رہی ہو' اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔"

اس کے بعد اس نے ملازم سے کہا۔

"ایک گلاس دودھ ان کے کمرے میں پہنچا دو۔"

حامی نے کہا۔

"نہیں' ابھی میں کچھ نہیں پیوں گی۔"

"کیسے نہیں پیو گی؟" کمال نے کہا۔ "تم نے صبح ناشتہ میں بھی نہیں پیا ہے۔ ڈاکٹر نے تاکید کی ہے کہ تمہیں صبح شام دودھ پینا چاہئے۔"

حامی سر جھکا کر زینے پر چڑھنے لگی۔ کمال اور صفدر اسے دھڑکتے ہوئے دل سے ایک رقیب کے پاس جاتے دیکھ رہے تھے۔ زبیدہ خاتون نے کمال سے کہا۔

"بیٹا! تم نے تو میری پوری بات سنی ہی نہیں۔"

"کون سی بات؟" کمال نے پوچھا۔

"یہی منیجر صاحب کے لڑکے کی بات۔ وہ یہاں انیکسی میں آ کر ٹھہرا ہوا ہے۔"

"انیکسی میں ٹھہرا ہوا ہے؟" صفدر اور کمال دونوں ہی چونک پڑے۔

"کب سے؟" کمال نے فوراً ہی پوچھا۔

منیجر نے جواب دیا۔

"یہی کچھ دیر پہلے۔ دس بجے کے قریب!"

"اس کا نام کیا ہے؟" صفدر نے پوچھا۔

"یوسف!"

ایک لمحہ کے لیے صفدر اور کمال دونوں ہی ساکت ہو کر منیجر کو تکنے لگے۔

☆------------☆------------☆

حامی سر جھکا کر کمرے میں داخل ہوئی۔ پھر دروازہ بند کر کے جیسے ہی اس نے سر اٹھایا تو ایک اجنبی کو دیکھ کر چونک گئی۔

وہ اس کی طرف پشت کئے کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔

"آپ...... آپ کون ہیں؟"

اس کے سوال پر شوکت نے آہستہ سے گھوم کر اسے دیکھا۔

حامی ایک ٹک اسے دیکھنے لگی۔ اجنبی کا چہرہ کچھ جانا پہچانا سا لگا۔ وہ ذہن پر زور ڈال کر سوچنے لگی۔ کون ہے یہ؟ اسے کہاں دیکھا ہے؟

اس کی آنکھوں میں الجھن دیکھ کر شوکت نے پوچھا۔

"تم نے مجھے نہیں پہچانا؟"

حامی نے ہولے سے نفی میں سر ہلا کر پوچھا۔

"کیا...... آپ مجھے پہچانتے ہیں؟"

"مجھے آپ نہ کہو حامی۔ ہم اتنے قریب رہ چکے ہیں کہ ایک دوسرے کو "تم" کہا کرتے تھے۔"

حامی نے غیر یقینی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں...... کیسے یقین کر لوں۔ دراصل میں...... میں اپنی......"

شوکت نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"تم اپنی یادداشت کھو چکی ہو۔"

"آپ جانتے ہیں؟"

"ہاں...... اور یہ جان کر مجھے کتنا صدمہ ہوا ہے' میں بیان نہیں کر سکتا۔ یہ کتنے دکھ

کی بات ہے کہ تم میری ہو کر بھی مجھے نہیں پہچان سکتیں۔"

حامی گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"آپ مجھے کس رشتے سے میری کہہ رہے ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں کسی کی بیوی ہوں' کسی کے گھر کی عزت ہوں۔"

"نہیں حامی! جو لڑکی اپنے آپ کو بھول چکی ہو' اس کا نکاح جائز نہیں ہو سکتا۔ تم اس وقت کسی کی بیوی نہیں ہو......"

"نہیں!" وہ پیچھے ہٹتی ہوئی دروازے تک آئی۔ "تم...... تم میرے فرض اور میرے ایمان کو ڈگمگانا چاہتے ہو۔ میں تم سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی۔"

وہ ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر آگئی۔ شوکت اسے آوازیں دیتا رہ گیا۔

حامی کمرے سے نکل کر اوپری برآمدے میں آئی اور پھر زینے اترتی ہوئی نیچے ڈرائنگ روم میں پہنچ گئی۔

"وہ..... وہاں......!" اس نے کمال سے ہانپتے ہوئے کہا۔ "میرے کمرے میں ایک اجنبی ہے۔"

کمال نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"گھبراؤ نہیں۔ میں جانتا ہوں۔"

"کون ہے وہ؟" زبیدہ خاتون نے ناراضگی سے پوچھا۔ "وہ حامی کے کمرے میں کیسے چلا گیا؟"

"ان کا نام شوکت ہے۔ وہ حامی کو بہت عرصہ سے جانتے ہیں۔ کیوں حامی! ذرا سوچنے کی کوشش کرو۔ تم نے کبھی شوکت کا نام سنا ہے؟"

"شوکت؟" حامی نے سوچتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف دیکھا۔

اس وقت شوکت زینے سے اترتا ہوا ان کی طرف آ رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"ہاں حامی! سوچنے کی کوشش کرو۔ اپنے ماضی کو بھول کر زندگی گزارنا بہت بڑی بدنصیبی ہے۔"

حامی نے کمال کا بازو تھام کر جواب دیا۔

"ایک شریف عورت کو اس کے خاوند کی محبت مل جائے تو وہ سب کچھ بھول جاتی

ہے۔ میں نے تو صرف اپنے ماضی کو بھلایا ہے۔"

اتنے میں ملازم دودھ سے بھرا ہوا گلاس لے آیا۔ حامی نے بگڑ کر کہا۔

"لے جاؤ یہاں سے۔ مجھے کچھ نہیں چاہئے۔"

ملازم واپس جانے لگا۔ شوکت نے اس کے ہاتھ سے دودھ کا گلاس لے کر حامی سے پوچھا۔

"کیا تم ثابت کر سکتی ہو کہ تمہیں اپنے خاوند سے سچی محبت ہے؟"

حامی نے کہا۔

"محبت کی سچائی کے لیے اگر مجھے جان بھی دینا پڑے تو میں انکار نہیں کروں گی۔"

"جان دینے کی ضرورت نہیں ہے۔" شوکت نے کہا۔ "تم جس علاقہ سے تعلق رکھتی ہو' وہاں کا دستور یہ ہے کہ دلہن اپنے ہاتھوں سے دلہا کو دودھ پلاتی ہے۔ لو یہ گلاس اور اپنے ہاتھوں سے کمال صاحب کو پلاؤ۔"

حامی نے اچانک دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام لیا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے دودھ کے ایک گلاس کی بجائے کئی گلاس گھومنے لگے۔ اس کے کانوں میں ممانی کی آواز گونجنے لگی۔

"شادی بیاہ کی ایک رسم یہ بھی ہے کہ دلہن اپنے ہاتھوں سے دولہا کو دودھ پلاتی ہے......"

آواز ممانی کی تھی لیکن حامی اس آواز کو نہ پہچان سکی۔

زبیدہ خاتون نے آگے بڑھ کر کہا۔

"لو بھلا یہ کوئی بڑی بات ہے۔ اپنے ہاتھوں سے خاوند کو دودھ پلانا کوئی بری بات تو نہیں۔"

انہوں نے دودھ کا گلاس شوکت سے لے لیا اور حامی کی طرف بڑھا کر کہا۔

"لو بیٹا۔ پلا دو۔ شرمانے کی کوئی بات نہیں ہے۔"

حامی نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے گلاس کو تھام لیا اور اسے کمال کے منہ کی طرف لے جانے لگی۔ شوکت نے مسکرا کر کہا۔

"تمہارے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ محبت کا اعتماد یوں ڈگمگا رہا ہے جیسے وہ دودھ کا

گلاس نہیں زہر کا پیالہ ہو۔"

گلاس اچانک اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ سر سے پیر تک اس طرح لرزنے لگی جیسے اب تب میں گرنے ہی والی ہو۔ کمال نے جلدی سے اسے تھام لیا۔

"حامی! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

"مم...... میرا سر چکرا رہا ہے۔"

کمال اسے ساتھ لے کر صوفہ پر بیٹھ گیا۔ حامی نے آنکھیں بند کر کے اپنا سر اس کے شانہ پر ٹیک دیا۔

صفدر اور شوکت دھڑکتے ہوئے دل سے اسے دیکھ رہے تھے۔ شوکت نے کہا۔

"کمال صاحب! اس واقعہ سے ثابت ہو گیا کہ حامی کا ذہن ماضی کی طرف بھٹکتا ہے۔ ابھی وہ بظاہر ایک وفا شعار بیوی ہے۔ مگر اتنی بھی وفا شعار نہیں کہ دودھ کا ایک گلاس آپ کو پلا سکے۔ اگر مکمل طور پر یادداشت واپس آ گئی' تو کیا ہو گا؟"

زبیدہ خاتون نے شوکت کو ناگواری سے دیکھ کر پوچھا۔

"کیا تم میری بہو کی وفاداری پر شبہ کر رہے ہو؟"

کمال نے جلدی سے کہا۔

"یہ بات نہیں ہے امی! میں ابھی آپ کو تمام باتیں تفصیل سے سمجھا دیتا ہوں۔ ذرا حامی کو اس کے کمرے تک چھوڑ آؤں تاکہ یہ آرام کر سکے۔ کیوں حامی؟"

حامی نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

"تم اپنے کمرے تک چل سکو گی؟"

"جی...... جی ہاں!"

وہ خود کو سنبھال کر صوفہ سے اٹھنے لگی۔ کمال بھی اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا پھر اس نے صفدر سے کہا۔

"تم منیجر صاحب کے ساتھ انیکسی میں جا کر دیکھو۔ شاید یوسف آ گیا ہو۔"

یہ کہہ کر اس نے حامی کا بازو تھام لیا اور اسے سہارا دے کر اس کے کمرے میں لے جانے لگا۔

☆-----------☆-----------☆

منیجر نے انیکسی میں داخل ہو کر چاروں طرف دیکھا' صفدر نے کہا۔

"آپ کے صاحبزادے ابھی نہیں آئے ہیں۔"

منیجر تھکے ہوئے انداز میں کرسی پر بیٹھ گیا اور بڑی اداسی سے بولا۔

"اس لڑکے نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ آہ! اگر میں عزت کی روٹی حاصل کرنے کے قابل نہ ہوتا تو میرا بڑھاپا کتنا عبرت ناک ہوتا۔ اپنی ذلت اور بیٹے کی آوارگی مجھے مار ڈالتی۔"

"مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔" صفدر نے ہمدردی کا اظہار کیا۔

"صفدر صاحب!" منیجر نے کہا۔ "آپ یوسف کے متعلق کیا جانتے ہیں؟ ذرا تفصیل سے بتائیں' تاکہ میں بیٹے کی صورت دیکھ کر اس کے اندر چھپے ہوئے شیطان کو نہ بھول جاؤں۔"

صفدر نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"آپ کے لئے اتنا ہی جان لینا کافی ہے کہ وہ شوکت صاحب کو قتل کرنے کی ناکام کوشش کر چکا ہے۔"

"یہ تو کمال صاحب مجھے بتا چکے ہیں کہ اس نے حمیدہ بیگم کو حاصل کرنے کی غرض سے یہ مجرمانہ حرکت کی تھی۔"

"جی ہاں' آپ کے صاحبزادے دس ہزار کے عوض حامی کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔ پنڈی میں ان کے پاس پانچ ہزار تھے۔ حامی کے ماموں اور ممانی سے انہوں نے وعدہ کیا کہ لاہور پہنچ کر باقی پانچ ہزار دیں گے لیکن راستے میں شراب پینے کے جرم میں گرفتار ہو گئے

اور اب وہاں سے چھوٹ کر آپ کے پاس آئے ہیں۔"

منیجر نے پریشانی سے کہا۔

"ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اگر وہ سزا بھگت کر آ رہا ہے تو اس کے پاس تیس ہزار روپے کہاں سے آ گئے؟"

"تیس ہزار؟" صفدر نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں' دو ہزار اس کی جیب میں تھے اور اٹھائیس ہزار اس نے اس الماری میں رکھے ہیں۔ پتہ نہیں نکال کر لے گیا ہے یا یہیں چھوڑ گیا ہے۔"

وہ اٹھ کر الماری کے پاس آیا اور اسے چابی سے کھولتے ہوئے بولا۔

"اس کی ایک چابی اس کے پاس بھی ہے۔"

وہ چمڑے کا بیگ الماری میں موجود تھا۔ منیجر نے اسے کھول کر صفدر کے آگے رکھ دیا۔

صفدر نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کہیں لمبا ہاتھ مارا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بیٹا چوری کرے اور باپ پکڑا جائے۔"

"بڑھاپے میں اب یہی ذلت اٹھانی رہ گئی ہے۔ ویسے وہ بہت چالاک ہے۔ جانتا ہے کہ مجھ جیسے ایماندار آدمی پر کسی کو شبہ نہیں ہوگا۔ اس کے یہ تیس ہزار یہاں محفوظ رہیں گے۔"

"تیس ہزار!" صفدر بڑبڑایا۔ تیس ہزار کا عدد اس کے ذہن میں چبھ رہا تھا۔

پھر یک بیک اس نے چونک کر کہا۔

"کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہ تیس ہزار وہ ماموں اور ممانی سے چھین کر لایا ہو؟"

"کون ماموں اور ممانی؟"

"وہی' جن کی لاشیں آپ دیکھ چکے ہیں۔"

"نہیں!" منیجر نے گھبرا کر کہا۔ "آپ ایسا نہ سوچیں۔ وہ ایک ہی وقت میں تین تین قتل نہیں کر سکتا۔"

صفدر نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"واقعات کی کڑیاں یہی سمجھاتی ہیں۔ یوسف سزا بھگتنے کے بعد سیدھا ماموں اور

ممانی کے پاس پہنچا ہوگا اور جب اسے پتہ چلا ہوگا کہ انہوں نے تیس ہزار میں حامی کو بیچ دیا ہے تو پھر آپ ہی سوچئے۔ کیا اس نے ماموں اور ممانی سے انتقام نہیں لیا ہوگا؟ پھر ایسی صورت میں جبکہ تیس ہزار روپے مفت ہاتھ آ رہے ہوں۔ آپ ذرا غور کریں۔ آنٹی نے پولیس انسپکٹر کو بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ انہوں نے حامی کے والدین کو تیس ہزار روپے دیئے تھے۔ پولیس کو وہاں صرف لاشیں ملیں' روپے نہیں ملے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ وہی روپے ہیں۔"

منیجر کا رنگ اڑ گیا۔ وہ سہمے ہوئے انداز میں صفدر کو دیکھنے لگا۔ پھر وہ یک بیک دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ کر رونے لگا۔

"میرے معبود! میرے نصیب میں ایسی ہی اولاد لکھی تھی....."

وہ بچوں کی طرح سسک سسک کر رونے لگا۔ صفدر نے اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے کہا۔

"منیجر صاحب! صبر سے کام لیں جو نصیب میں ہوتا ہے' وہ پورا ہو کر رہتا ہے۔"

منیجر نے اس کے ہاتھ کو تھام کر کہا۔

"صفدر صاحب! خدا کی قسم اگر وہ یہاں آ گیا تو میں اپنے ہاتھوں سے اسے قانون کے حوالے کر دوں گا۔"

"مجھے یقین ہے۔ آپ جیسے ایماندار لوگ ہی قانون کا تحفظ کرتے ہیں۔"

منیجر نے چمڑے کا بیگ دیکھ کر کہا۔

"آپ یہ روپے یہاں سے لے جائیں۔ اسے کوٹھی میں حفاظت سے رکھ دیں۔ مجھے یقین ہے کہ یوسف ان روپوں کے لیے ضرور آئے گا۔"

"اچھی بات ہے۔ میں انہیں لے جاتا ہوں۔ وہ آئے تو اسے کسی بہانے سے روک کر ہمیں اطلاع دے دیں۔ ہم اس سے نمٹ لیں گے۔"

صفدر نے چمڑے کے بیگ کے پاس آ کر اسے بند کر دیا۔ پھر اس نے بڑی ہمدردی سے منیجر کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد بیگ کو اٹھا کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

☆------------☆------------☆

رات کے نو بجے تھے۔

یوسف نے مین گیٹ کے قریب پہنچ کر دیکھا۔ کوٹھی کے باہر گہرا سناٹا تھا۔ اندر روشنی تھی جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ کوٹھی کے افراد ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

یوسف کو کوٹھی والوں سے کچھ مطلب نہیں تھا۔ وہ صرف اپنے روپے لینے آیا تھا۔ رات کے اندھیرے میں وہ اپنی رقم لے کر فرار ہونا چاہتا تھا۔ اس نے گہری نظروں سے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔

دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن کمرے میں تاریکی تھی۔ اس نے ہولے سے آواز دی۔

"ڈیڈی!"

"آجاؤ برخوردار!" اندھیرے سے منیجر کی آواز آئی۔ "تم کہاں چلے گئے تھے؟"

"بس یونہی۔ ذرا دوستوں نے روک لیا تھا۔ کمرے میں یہ اندھیرا کیوں ہے؟"

"یہ میری بوڑھی زندگی کا اندھیرا ہے بیٹے۔ تم اجالا کر دو۔"

یوسف نے سوئچ کو ٹٹول کر آن کر دیا۔ پھر کمرے میں روشنی ہوتے ہی وہ حیرت سے اچھل پڑا۔ اس کا باپ اس کے سامنے ریوالور تانے کھڑا ہوا تھا۔

"کیوں بیٹے! موت کو دیکھ کر گھبرا کیوں گئے؟"

یوسف نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ڈیڈی! باپ کے ہاتھوں سے مر کر میں شہید کہلاؤں گا۔ مجھے مرنے کا افسوس نہیں ہوگا۔ ہاں، مگر تعجب ضرور ہے کہ آپ نے یہ پینترا کیوں بدلا ہے؟"

"میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ اگر تمہارا جرم ثابت ہو گیا تو میں باپ اور بیٹے

کے رشتے کو بھول جاؤں گا۔"

"اچھا، میں بھی ذرا سنوں کہ میرا جرم کیا ہے؟"

"تیس ہزار! تم نے وہ روپے ماموں اور ممانی سے حاصل کئے ہیں۔"

وہ بوکھلا کر باپ کو دیکھنے لگا پھر اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"یہ...... یہ جھوٹ ہے، کسی نے آپ کو بہکایا ہے۔"

"اگر یہ جھوٹ ہے تو کوٹھی میں چلو اور ثابت کرو کہ تم مجرم نہیں ہو۔"

"کوٹھی میں؟" اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"ہاں۔ میں نے وہ روپے کوٹھی میں رکھوا دیئے ہیں۔ دوپہر سے یہاں بیٹھا انتظار کر رہا ہوں کہ تم ضرور آؤ گے۔"

یوسف دانت پیس کر رہ گیا۔ اتنی بڑی رقم ہاتھوں سے نکل کر کوٹھی میں چلی گئی تھی۔ اس نے اپنے غصہ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"ڈیڈی! جب وہ رقم ہی نہ رہی تو میں کوٹھی میں جا کر کیا کروں گا۔ آپ اس ریوالور کو رکھ لیجئے۔ میں واپس جا رہا ہوں۔"

"نہیں! اگر تم نے میری مرضی کے خلاف کوئی حرکت کی تو میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔"

یوسف نے غصہ سے پوچھا۔

"آپ باپ ہیں یا میرے دشمن؟"

"دشمن!"

"اچھی بات ہے، تو پھر کوٹھی میں چلئے۔"

"چلو!" منیجر آگے بڑھا۔

یوسف باہر جانے کے لیے دروازے کی طرف پلٹا پھر اتنی ہی تیزی سے دوسری طرف پلٹ کر ریوالور پر ہاتھ مار دیا۔ ریوالور منیجر کے ہاتھ سے نکل کر فرش پر آگرا۔ منیجر فرش کی طرف جھکا مگر یوسف نے پیچھے سے گردن دبوچ لی۔

"آپ مجھے کوٹھی میں لے جائیں گے؟"

"ہاں، ہاں۔ تو مجرم ہے۔"

یوسف نے گردن پر اپنی گرفت سخت کر دی۔

"آپ مجھے پولیس کے حوالے کرنا چاہتے ہیں؟"

"چھوڑ...... چھوڑ دے مجھے....." باپ بیٹے کی گرفت میں تڑپنے لگا۔

"آپ مجھے پھانسی کے تختے پر چڑھانا چاہتے ہیں۔"

منیجر کے حلق سے آواز نہ نکل سکی۔ وہ جوان بازوؤں کی گرفت میں کانپنے لگا۔

"میرے دشمن ڈیڈی؟ آپ نے زندگی میں بہت کچھ دیکھا ہے۔ اب باپ اور بیٹے کی انوکھی محبت کا یہ تماشہ دیکھتے ہوئے اس دنیا سے جائیے۔ آپ خوش نصیب ہیں کہ بیٹے کے ہاتھوں مر کر شہادت کا درجہ پا رہے ہیں۔"

منیجر کی آنکھیں پھیل گئیں' ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ یوسف تھوڑی دیر تک اس کی گردن پر اپنی قوت آزماتا رہا' پھر اس نے آہستگی سے اسے فرش پر ڈال دیا۔

باپ کی لاش بیٹے کے سامنے پڑی ہوئی تھی اور بیٹے کی آنکھیں جوش اور جنون کی حالت میں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے فرش پر سے ریوالور کو اٹھا لیا۔

"تیس ہزار!" اس نے فیصلہ کیا۔ "اتنی بڑی رقم کوٹھی والوں کو مفت دے کر جانا حماقت ہے۔ پھر وہ مجرم کی حیثیت سے مجھے پہچان گئے ہیں۔ اسی لئے ڈیڈی مجھے ان کے پاس لے جا رہے تھے۔ میرے جرم کو ثابت کرنے والا کوئی گواہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں ایک ایک کو چن چن کر قتل کر دوں گا۔"

اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر کمرے کی لائٹ بجھا دی۔

پھر وہ انیکسی کے باہر آیا اور کوٹھی کی طرف دیکھنے لگا۔ دشمنوں کو مارنے سے پہلے روپے حاصل کرنا ضروری تھے۔ اس نے سوچا روپے کہاں ہو سکتے ہیں؟ کسی آئرن سیف میں۔ اور آئرن سیف کہاں ہو سکتا ہے؟ اس کوٹھی کی سب سے بڑی ہستی کے کمرے میں۔ یعنی زبیدہ خاتون کی کمرے میں۔

وہ تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا کوٹھی کے پچھلے حصے کی طرف جانے لگا۔

اسی وقت کوٹھی کے مین گیٹ پر عثمان کنڈیکٹر پہنچ گیا۔ اس نے کوٹھی کا نمبر پڑھتے ہوئے کہا۔ "ہت تیرے کی۔ سالا یئی صفدر بھائی کا مکان ہے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے یہ ٹائم ہو گیا۔"

پھر وہ اپنی جیب سے ایک بڑا ساتہہ کیا ہوا کاغذ نکال کر بڑبڑایا۔

"ارے بابا۔ یہ اتنا بڑا سرٹیفکیٹ سات روپے میں گروی رکھ کے آ گیا۔ ادھر میں مہاجن بولتا ہے کہ صفدر کو دے کے آؤ۔ ہم بھی سالا کیا ریکارڈ کے مافق بولتا رہتا ہے۔ اب ادھر میں صفدر بھائی کو کیسا کر کے بلائے گا؟"

وہ بڑبڑاتا ہوا انیکسی کے سامنے آ کر رک گیا۔ انیکسی کے اندر گہری تاریکی تھی۔

"ادھر میں تو ایسا مافق اندھیرا جیسا قبر میں ہوتا ہے۔ باپ رے! ادھر میں کوئی جندہ نئی مردہ رہنے سکتا ہے۔"

وہ اپنی عادت سے مجبور بکواس کرتا ہوا پورچ تک آیا۔ سامنے برآمدہ تھا اور برآمدے کی ایک دیوار پر سوئچ بورڈ نظر آ رہا تھا۔

اس نے آگے بڑھ کر کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔

☆------------☆------------☆

ریوالور کو دیکھتے ہی حامی اور زبیدہ خاتون سکتے میں رہ گئیں۔ یوسف نے غرا کر کہا۔

"اگر ذرا بھی آواز نکلی تو گولی چلا دوں گا۔ چلو اپنا آئرن سیف کھولو۔"

زبیدہ خاتون خوف سے کانپتی ہوئی آئرن سیف کھولنے لگیں۔

یوسف نے حامی سے کہا۔

"میری جان! تم تو ایسے دیکھ رہی ہو جیسے کبھی کی جان پہچان نہ ہو۔"

حامی نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے۔"

"ہائے ایسی بھی کیا بے رخی۔ اپنے پرانے یار کو بھولنے کا ناٹک کر رہی ہو۔"

پھر اس نے زبیدہ خاتون کو دھکا دے کر آئرن سیف کے پاس سے ہٹا دیا۔

چمڑے کا بیگ وہاں موجود تھا۔ وہ بیگ کو کھول کر سیف میں رکھی ہوئی نوٹوں کی گڈیاں ٹھونسنے لگا۔

اس کے بعد اس نے زبیدہ خاتون کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر ان کے ہاتھ پاؤں کو اچھی طرح باندھ دیا پھر حامی کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"تم نے مجھے بہت تڑپایا ہے۔ مجھے ہر جگہ ٹھوکریں کھانے اور ذلتیں برداشت کرنے پر مجبور کیا ہے لیکن آج میں جان پر کھیل کر آیا ہوں۔ آؤ' خاموشی سے میری آغوش میں آ جاؤ۔"

"تھو ہے تم پر!" وہ پیچھے ہٹنے لگی۔ "میں جان دے سکتی ہوں مگر عزت نہیں دے

سکتی۔"

وہ آگے بڑھنے لگا۔

"مجھے تمہاری جان کی نہیں' تمہارے اس قیامت خیز جسم کی ضرورت ہے۔ آؤ' میری برسوں کی پیاس بجھا دو۔"

اس نے حامی کو بازوؤں میں جکڑنے کی کوشش کی لیکن اس سے پہلے اسے اس کے منہ پر ہاتھ رکھنا پڑا۔ وہ چیخنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"میں کہتا ہوں کہ خاموشی سے اپنے آپ کو میرے حوالے کر دو۔ ورنہ اس بڑھیا کی طرح تمہارے منہ پر بھی پٹی باندھنا پڑے گی۔"

اس کی بات پوری ہوتے ہی حامی مچل کر اس کی گرفت سے نکل کر دروازے کی طرف بھاگی۔ "کمال!" اس کے حلق سے صرف ایک ہی آواز نکلی۔ دوسری آواز نکلنے سے پہلے ہی اسے بے قابو ہوتے دیکھ کر یوسف نے ریوالور کا دستہ اس کے سر پر مار دیا۔ بڑا ہی زبردست اور بھرپور ہاتھ پڑا تھا۔ حامی تیورا کر چوکھٹ پر گر پڑی۔

یوسف نے پھرتی سے چمڑے کے بیگ کو اٹھایا اور حامی کو پھلانگتا ہوا اوپری برآمدے پر زینے کے قریب آ گیا۔ حامی کی آواز سن کر کمال زینے کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے ڈرائنگ روم کے ایک صوفہ پر شوکت بیٹھا ہوا تھا۔

یوسف نے للکار کر کہا۔

"خبردار! کوئی حرکت نہ کرے۔"

شوکت اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ کمال جہاں تھا' وہاں رک گیا۔ یوسف نے حکم دیا۔

"چلو تم دونوں ایک ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔ صفدر کہاں ہے؟"

وہ چاروں طرف دیکھنے لگا۔

"بتاؤ' صفدر کہاں ہے؟" اس نے گرج کر پوچھا۔

"وہ یہاں نہیں ہے۔" کمال نے کہا۔ "تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟"

"یہ یوسف ہے!" شوکت نے کہا۔

"اوہ!" کمال اسے ناگواری سے دیکھنے لگا۔ "ہمارا نمک کھا کر تم نمک حرامی کرنے آئے ہو؟"

"بکواس مت کرو۔ صفدر کو آواز دے کر بلاؤ۔"

"میں کہہ چکا ہوں' وہ یہاں نہیں ہے۔"

یوسف نے دانت پیس کر کہا۔

"مجھ سے زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرو۔ سنو! میرے دائیں ہاتھ کی طرف حامی بیہوش پڑی ہوئی ہے۔ میں تین تک گنتا ہوں' اگر صفدر سامنے نہ آیا تو میں حامی کو گولی مار دوں گا۔"

کمال اور شوکت گھبرا کر اوپری برآمدے کی طرف دیکھنے لگے۔ انہیں حامی تو نظر نہ آئی لیکن یوسف کی بات پر یقین کرنا پڑا۔ کیونکہ وہ تھوڑی دیر پہلے حامی کی سہمی ہوئی آواز سن چکے تھے۔ اب اس کی طویل خاموشی بتا رہی تھی کہ وہ یقیناً بیہوش ہو گئی ہے۔

"ایک!" اس نے ریوالور کا رخ حامی کی طرف کر دیا۔

"دو!" وہ غرا کر بولا۔

پھر تین بولنے سے پہلے ہی ڈرائنگ روم کا دروازہ کھل گیا۔ صفدر اور عثمان ہنستے ہوئے داخل ہوئے لیکن پھر زینے کی طرف دیکھتے ہی ان کی ہنسی گھٹ کر رہ گئی۔

عثمان نے یوسف کو دیکھتے ہی کہا۔

"ارے صفدر بھائی' یہ تو اپنا یار ہے' اپنا یوسف بھائی۔ اس سے ڈرنے کا کیا بات ہے۔ یہ تو خالی پیلی مسکری کرتا ہے۔"

"بکواس مت کرو۔" یوسف نے گرج کر کہا۔ "چپ چاپ سامنے آ کر کھڑے ہو جاؤ تاکہ تم لوگوں کا نشانہ لینے میں دشواری نہ ہو۔"

وہ دونوں خاموشی سے کمال اور شوکت کے قریب آ گئے۔ یوسف نے صفدر سے کہا۔

"تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ اسے پھینک دو۔"

صفدر نے دونوں ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذ کو آگے بڑھا کر کہا۔

"یہ میری زندگی کا سرمایہ ہے۔ انجینئرنگ کالج کا ڈپلومہ ہے لیکن یہ بڑا ہی منحوس ثابت ہو رہا ہے۔ اسے حاصل کرنے کے بعد میں فاقے کرتا رہا۔ پھر اسے سات روپے میں گروی رکھنا پڑا۔ آج یہ میرے پاس واپس آیا ہے تو تم میری موت بن کر یہاں آ گئے ہو۔

یوسف! اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت تمہارا پلہ بھاری ہے۔ اب ہمیں کوئی موت کے منہ سے نہیں بچا سکتا لیکن میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ مارنے سے پہلے میری ایک چھوٹی سی خواہش پوری کر دو۔"

یوسف نے گھور کر کہا۔

"کوئی چال چلنا چاہتے ہو؟"

صفدر نے کہا۔

"تمہارے ہاتھ میں ریوالور ہے اور انگلی ٹریگر پر ہے۔ جتنی دیر میں' میں ایک قدم بڑھاؤں گا' اتنی دیر میں تم ہم سب کو بھون کر رکھ دو گے۔ پھر میری آخری خواہش ایسی ہے کہ اس میں تمہیں کوئی مکاری نظر نہیں آئے گی۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم اس منحوس ڈپلومہ پر تھوک دو جس کی وجہ سے مجھے آج یہ دن دیکھنا پڑ رہا ہے۔ یہ لو......"

پھر اس سے پہلے کہ یوسف اس کی باتوں کا مطلب سمجھتا' صفدر نے کاغذ کے سرے کو پکڑ کر اس کی طرف پھینک دیا۔ کاغذ فضا میں اچھا' پھڑپھڑایا اور اس میں چھپا ہوا چاقو تیر کی طرح جا کر یوسف کے بازو میں پیوست ہو گیا۔

ریوالور ہاتھ سے چھوٹ کر زینے پر قلابازیاں کھانے لگا۔ سب کے سب ریوالور کی طرف لپکے لیکن صفدر پرسکون تھا۔ وہ آگے بڑھ کر فرش پر جھکا' جرمن ٹیکنیکل کالج کے سرٹیفکیٹ کو اٹھا کر چوما' آنکھوں سے لگایا اور اسے احتیاط سے تہہ کرتا ہوا زینے پر چڑھنے لگا۔

ریوالور کمال کے ہاتھ میں آ گیا تھا اور شوکت' یوسف کو بالوں سے پکڑ کر بری طرح پیٹ رہا تھا۔ صفدر تیزی سے زینے طے کرتا ہوا حامی کے قریب پہنچ گیا۔

وہ چوکھٹ پر بے ہوش پڑی تھی۔

صفدر نے اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا لیا۔ دھڑکتے ہوئے دل نے کہا۔

"حامی..... میری حامی! آج پھر تم میرے بازوؤں میں آ گئی ہو۔ میری جان..... میری زندگی! میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔"

☆-----------☆-----------☆

ڈاکٹر نے انجکشن دینے کے بعد حامی کی نبض تھام لی اور اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگا۔

شوکت' صفدر اور کمال ڈرائنگ روم میں ڈاکٹر کا انتظار کر رہے تھے۔ ڈاکٹر نے ان سے کہا تھا کہ مریضہ کے پاس زیادہ بھیڑ نہ ہو۔ ہوش میں آتے وقت اسے تنہا اور پُرسکون ہونا چاہئے۔

اسی لئے وہ تینوں بے چینی سے ڈاکٹر کا انتظار کر رہے تھے۔ البتہ زبیدہ خاتون حامی کے پاس موجود تھیں۔ اس وقت ان کے دل و دماغ میں بھی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ جب سے وہ حامی کو بہو بنا کر لائی تھیں' تب سے مصیبت پر مصیبت آ رہی تھی۔ پھر کمال کی زبانی انہیں حامی کی ساری ہسٹری معلوم ہو چکی تھی۔ یہ سننے کے بعد کہ وہ پہلے شوکت سے اور پھر صفدر سے منسوب ہوتی رہی ہے' زبیدہ خاتون کو بہت برا لگا تھا۔ مختلف مردوں کے پاس بھٹکنے والی لڑکی ان کی بہو بن گئی تھی۔

انہوں نے بیٹے کو سمجھایا کہ وہ حامی کا خیال چھوڑ دے لیکن وہ اسے بھولنے پر آمادہ نہ ہو سکا۔ اس نے ضد کی کہ آخر اس میں حامی کی کیا غلطی ہے۔ اس نے شوکت سے بے وفائی نہیں کی' لیکن شوکت کی عارضی موت نے اسے صفدر کا سہارا لینے پر مجبور کر دیا پھر اس نے صفدر سے بھی بے وفائی نہیں کی لیکن یادداشت کھونے کی وجہ سے وہ کمال کی شریک حیات بن کر آ گئی۔ تقدیر اس سے عجیب مذاق کر رہی تھی۔ وہ معصوم تھی' وہ مظلوم تھی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اب تک ایک پاکباز اور باعصمت

لڑکی تھی۔

کمال نے حامی کی حمایت میں اتنا کچھ کہا کہ زبیدہ خاتون قائل ہو گئیں۔ یوں بھی ایسی لاوارث لڑکیاں بہت کم دیکھنے میں آئی ہیں جو ہوس پرست بھیڑیوں سے خود کو بچا کر رکھتی ہیں۔ حامی ہزار بدنصیب ہونے کے باوجود خوش نصیب تھی کہ آج بھی معصوم اور پاکباز تھی۔

پھر زبیدہ خاتون کی محبت حامی کے لیے پہلے سے بڑھ گئی۔ اب انہیں یہ فکر تھی کہ شوکت اور صفدر کو کسی طرح یہاں سے چلتا کریں۔ صفدر سے پھر بھی اطمینان تھا کہ اس نے کمال کے لیے پہلے بھی محبت کی قربانی دی تھی اور اب بھی دے سکتا تھا مگر شوکت ایک بن بلائے مہمان کی طرح یہاں آ کر بیٹھ گیا تھا اور یہ ثابت کر رہا تھا کہ کمال اور حامی کا نکاح ہونے کے باوجود ان کا رشتہ عارضی ہے۔

یہ بات سوچ کر زبیدہ خاتون کو شوکت پر غصہ آنے لگا۔ ان کا بس چلتا تو وہ اسے اپنے گھر میں کبھی برداشت نہ کرتیں مگر وہ اخلاقاً مجبور تھیں۔ کمال کی بھی یہی ضد تھی کہ وہ تینوں یہاں موجود رہیں کیونکہ ان کا محبت کا فیصلہ صرف حامی ہی کر سکتی تھی۔

زبیدہ خاتون بغور حامی کو دیکھنے لگیں۔ "نہیں یہ تو میرے بیٹے کو چاہتی ہے۔ یہ میرے بیٹے کے سوا کسی کا نام اپنی زبان پر نہیں لائے گی۔"

ڈاکٹر نے آہستگی سے کہا۔

"یہ ہوش میں آ رہی ہیں۔ کسی سے کہئے کہ د[illegible] میں اوولٹین ملا کر لے آئے۔"

"میں ابھی ملازم سے کہتی ہوں۔" زبیدہ خاتون کمرے سے باہر جانے لگیں۔

حامی کی آنکھیں بند تھیں مگر پھول سی پتی جیسے نازک لب ہولے ہولے کانپ رہے تھے۔ شاید وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ڈاکٹر اس کے قریب ذرا سا جھک گیا تاکہ اس کی آواز سن سکے۔ وہ بڑی مشکل سے کراہ رہی تھی۔

"آہ' آہ! صف.... در.... صف.... در!"

زبیدہ خاتون کمرے میں واپس آ گئیں۔ حامی کو آہستہ آہستہ کراہتے سن کر وہ بھی قریب آ کر جھک گئیں اور محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔

حامی کی بڑبڑاہٹ کچھ اور واضح ہو گئی۔

"مم..... مجھے..... مار ڈالو..... مگر میں..... شادی..... نہیں کروں گی..... کل صبح وہ آئیں گے..... پندرہ ہزار لے کر آئیں گے..... اب میں آپ لوگوں کے فریب میں نہیں آ سکتی.....!"

پندرہ ہزار! زبیدہ خاتون کے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ پندرہ ہزار کا مطلب یہی تھا کہ حامی اس وقت صفدر کو یاد کر رہی ہے۔

وہ دھڑکتے ہوئے دل سے اپنی بہو کو دیکھنے لگیں۔ انہوں نے اپنی اہمیت جتانے کے لئے کہا۔

"آنکھیں کھولو بیٹا! دیکھو، میں تمہاری خالہ ہوں۔ کمال تمہارے لئے بہت پریشان ہے۔"

وہ آہستہ آہستہ آنکھیں کھولنے لگی۔ پہلے اس نے ڈاکٹر کو دیکھا۔

"گھبراؤ نہیں، تم بالکل ٹھیک ہو۔" ڈاکٹر نے کہا۔

حامی ذرا سا سر گھما کر زبیدہ خاتون کو دیکھنے لگی۔ وہ بڑی محبت اور شفقت سے بولیں۔

"خدا تمہیں ہر آفت سے محفوظ رکھے، میں کل صبح ہی دیگ پکوا کر داتا دربار بھیجوں گی۔"

حامی نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

"آپ..... آپ کون ہیں؟"

زبیدہ خاتون کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔

"میں..... میں تمہاری خالہ جان ہوں۔ کمال کی امی.....!"

"ٹھہریئے!" ڈاکٹر نے کہا۔ "ابھی آپ ان سے باتیں نہ کریں۔ ان کی یادداشت واپس آ گئی ہے۔"

زبیدہ خاتون نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"تو کیا..... یہ ہمیں نہیں پہچانے گی؟"

"ضرور پہچانیں گی لیکن فی الحال یہ اپنی گمشدہ یادوں سے متاثر ہو رہی ہیں۔ آپ انہیں موقع دیجئے کہ یہ تنہائی میں اپنے ماضی کے واقعات کو اچھی طرح یاد کر سکیں۔"

اسی وقت ملازم دودھ اوولٹین کا گلاس لے آیا۔ زبیدہ خاتون اور ڈاکٹر نے سہارا دے کر حامی کو اٹھایا۔ وہ آہستہ آہستہ گلاس سے چسکیاں لینے لگی۔ ڈاکٹر نے کہا۔

"اب مجھے اجازت دیجئے۔ انہیں سوتے وقت یہ گولیاں کھلا دیجئے گا۔ میں کل صبح پھر آؤں گا۔"

وہ اپنا بیگ اٹھا کر واپس چلا گیا۔ حامی گلاس کو دونوں ہاتھوں سے تھامے اوولٹین پی رہی تھی۔

زبیدہ خاتون کچھ سوچتے ہوئے وہاں سے اٹھ کر الماری کے پاس آئیں اور اسے کھولتی ہوئی بولیں۔

"دراصل بات یہ ہے حامی کہ کچھ عرصہ کے لیے تم اپنا ماضی بھول گئی تھیں۔ اب تمہیں ماضی یاد آ رہا ہے تو تم ہمیں بھول جانا چاہتی ہو۔"

وہ الماری سے ایک البم لے کر اس کے پاس آئیں۔ حامی کا گلاس خالی ہو چکا تھا۔ انہوں نے گلاس لے کر البم اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ذرا اسے کھول کر دیکھو۔"

حامی نے البم لے کر کھولا۔ پہلے ہی صفحہ پر اس کی تصویر تھی۔ وہ دلہن بنی ایک دولہے کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ زبیدہ خاتون نے کہا۔

"یہ میرا بیٹا اور تمہارا خاوند کمال احمد ہے۔"

حامی حیرت سے تصویر کو دیکھنے لگی۔ کمال کا چہرہ اسے یاد آ رہا تھا۔ زبیدہ خاتون بولتی جا رہی تھیں۔ ہسپتال کے دن، ہسپتال کی راتیں، شادی کے ہنگامے، قاضی صاحب کی آواز حامی کے کان میں آ رہی تھی۔ "کمال احمد ولد جمال احمد کے ساتھ نکاح قبول ہے؟ قبول ہے، قبول ہے، قبول ہے۔"

حامی کے ہاتھوں سے البم چھوٹ گیا۔ وہ اپنا سر تھام کر رہ گئی۔ میرے اللہ! یہ کیا ہو گیا۔ میں تو صفدر کے سوا کسی اور کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ پھر میں نے کمال صاحب کو کیسے قبول کر لیا؟

کمال صاحب۔ اس کی نگاہوں کے سامنے کمال کا چہرہ گھومنے لگا۔ اس کی محبت بھری باتیں یاد آتی گئیں۔

زبیدہ خاتون نے اسے اپنی بانہوں میں لے کر کہا۔

"تم اپنے ذہن کو نہ الجھاؤ۔ خدا کو یہی منظور تھا کہ تم میری بہو بن کر یہاں آؤ۔ اب تم ایک شریف آدمی کی شریک حیات اور اس گھر کی عزت ہو۔ تم ذرا سوچو گی تو تمہیں یاد آئے گا کہ کمال تمہیں کتنی شدت سے چاہتا ہے۔"

زبیدہ خاتون پوری کوشش کر رہی تھیں کہ کمال' حامی کے ذہن پر چھا جائے۔ حامی کو بھی یہ احساس ہو گیا تھا کہ وہ نکاح کی بندش میں قید ہو گئی ہے لیکن پھر بھی اس کے دل و دماغ میں صفدر ہی صفدر تھا۔ وہ کہاں ہے؟ اب تک اس کی خبر لینے کیوں نہیں آیا؟ حامی کے ذہن میں طرح طرح کے سوالات گردش کر رہے تھے۔

زبیدہ خاتون اس کے پاس سے اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔ ان کے جاتے ہی حامی کی زبان سے بے اختیار نکلا۔

"صفدر! یہ کیا ہو گیا ہے؟ کیا تم میری اس غلطی کو معاف کر سکو گے؟ جو کچھ بھی ہوا ہے وہ میرے انجانے میں ہوا ہے۔ اب تو میں تمہارے قابل بھی نہ رہی۔ نہ جانے سہاگ کے کتنے دن اور کتنی راتیں میں اپنے خاوند کے ساتھ گزار چکی ہوں۔ اف میرے اللہ! میں کن بھول بھلیوں سے گزر کر اس مقام تک پہنچی ہوں۔"

کمرے کا دروازہ کھلتے ہی اس کی بڑبڑاہٹ ختم ہو گئی۔ اس بار زبیدہ خاتون کے ساتھ کمال بھی آیا تھا۔ کمال کو دیکھتے ہی حامی نے سر پر آنچل رکھ لیا۔ زبیدہ خاتون نے کہا۔

"دیکھا کمال! حامی نے تمہیں پہچان لیا۔ شریف عورتوں کی یہی پہچان ہے کہ وہ خاوند کو دیکھتے ہی سر پر آنچل رکھ لیتی ہیں۔"

کمال نے قریب آ کر پوچھا۔

"اب کیسی ہو حامی؟"

حامی جواب دیتے ہوئے جھجکنے لگی۔ زبیدہ خاتون نے کہا۔

"تم دونوں باتیں کرو' میں ابھی آتی ہوں۔"

وہ مسکراتی ہوئی کمرے سے چلی گئیں۔ کمال نے کہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ تمہاری یادداشت واپس آ گئی ہے۔ اب تم اپنے ماضی کو اور اپنے آپ کو پہچاننے لگی ہو۔ تمہاری زندگی کی داستان بھی عجیب حامی! پہلے تو شوکت سے

منسوب ہونے والی تھیں' پھر حالات نے تمہیں صفدر کے قریب پہنچا دیا اور اس کے بعد تم میری شریکِ حیات بن کر یہاں آ گئیں۔"

حامی نے سر جھکا کر پوچھا۔

"آپ کو یہ تمام باتیں کس طرح معلوم ہوئیں؟"

"کل ہی مجھے تمام واقعات کا پتہ چلا ہے۔ تمہیں یہ سن کر حیرت ہو گی کہ تم جس شوکت کو مردہ سمجھ رہی ہو' وہ زندہ ہے۔"

"جی!" وہ چونک کر غیر یقینی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ "یہ...... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تو مر چکے ہیں۔"

"نہیں حامی! وہ زندہ ہیں۔ انہوں نے زہریلا دودھ نہیں بلکہ نشہ آور دودھ پیا تھا۔ تمہیں یقین نہیں ہے تو چل کر دیکھو' وہ اس وقت بھی نیچے انتظار کر رہا ہے۔"

حامی کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس کی پہلی محبت اس کا انتظار کر رہی تھی۔ موت کے ظالم شکنجے سے نکل کر پھر اس کے حضور آ گئی تھی۔ کمال نے کہا۔

"تمہارے لئے سب ہی پریشان ہیں۔ ڈرائنگ روم میں شوکت ہی نہیں' صفدر بھی تمہارے لئے بیتاب ہے۔"

صفدر! حامی کی آنکھوں میں خوشی کی ایک چمک سی پیدا ہوئی لیکن پھر دوسرے ہی لمحے وہ چمک ماند پڑ گئی۔ اسے فوراً ہی احساس ہو گیا کہ وہ ایک مثلث میں گھری ہوئی ہے۔ پہلا وعدہ...... دوسرا وعدہ...... اور شاید تیسرا وعدہ بھی جو خاوند کے روپ میں سامنے کھڑا تھا۔

وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی کہ وہ کس طرح بیک وقت تینوں کا سامنا کر سکے گی۔ کس طرح ایک سے وفا کرے گی اور دوسرے بے وفائی کا الزام اٹھائے گی۔

وہ یک بیک گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگی۔

کمال نے محبت سے اس کے شانہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"میں تمہاری پریشانیوں کو سمجھتا ہوں۔ ویسے سب سے پہلے یہ بات میں تمہارے ذہن نشین کر دوں کہ تم درحقیقت میری شریکِ حیات نہیں ہو۔"

حامی نے چونک کر اسے دیکھا۔ کمال نے کہا۔

"ہاں' یہ سچ ہے جو لڑکی اپنے آپ کو بھول چکی ہو' اس کا نکاح جائز نہیں ہوتا۔
سوچنے کی بات ہے کہ نکاح کے وقت اگر صفدر تمہارے ذہن میں محفوظ ہوتا تو تم کبھی اس سے بے وفائی کر کے یہ نکاح قبول نہیں کرتیں۔ یہ محض قسمت کی ستم ظریفی ہے کہ تم میری بیوی بن گئیں۔ اب میں تمہیں اتنی شدت سے چاہنے لگا ہوں کہ تمہاری جدائی کا تصور بھی مجھے مارے ڈالتا ہے۔

"مگر حامی! شوکت' صفدر اور میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم تمہیں پریشان نہیں کریں گے۔ ہم اپنی اپنی محبت کا واسطہ نہیں دیں گے۔ تمہیں پوری آزادی ہے۔ تم نے ہم تینوں کو قریب سے دیکھا ہے' اب تمہارا ذہن کس سے زیادہ متاثر ہے؟ اور کسے تم اپنی زندگی کا ساتھی بنا سکتی ہو؟ اس کا فیصلہ تم..... اور صرف تم کر سکتی ہو۔"

حامی دیدے پھیلائے سامنے دیوار کی طرف ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔

فیصلہ..... بہت مشکل تھا۔

☆-----------☆-----------☆

حامی اسی طرح دیدے پھیلائے ڈرائنگ روم کے ایک صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔
اس کے سامنے مختلف صوفوں پر اس کے تینوں محبوب بیٹھے ہوئے تھے۔

شوکت نے کہا۔

"حامی' تمہاری خاموشی بتا رہی ہے کہ تم بہت پریشان ہو؟"

"جی..... جی نہیں تو....." وہ چونک کر بولی۔

کمال نے کہا۔

"میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ہم تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتے۔ تمہاری خوشی میں ہماری خوشی ہے۔ تم جس کا بھی انتخاب کرو گی ہم تمہیں دل سے مبارکباد دیں گے۔"

"یقیناً!" شوکت نے کہا۔ "تمہیں بلا جھجک اپنی پسند کا اظہار کرنا چاہئے۔"

حامی نے کن انکھیوں سے صفدر کی جانب دیکھا۔ سب بول رہے تھے' صرف وہی خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ وہ سر جھکا کر بولی۔

"حالات نے مجھے اس قابل نہیں رکھا ہے کہ میں آپ لوگوں سے آنکھیں بھی ملا سکوں۔ میں نے وعدہ کیا اور وعدہ شکنی کی۔ پھر بھی آپ لوگ دل سے میری قدر کر رہے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیں کہ میں کس طرح اپنے قدر دانوں کی ناقدری کروں۔

"کسی کے سامنے گلاب کے تین پھول رکھ دیجئے۔ وہ تینوں کی قدر کرے گا۔ کیونکہ تینوں ہی خوبصورت ہیں اور تینوں ہی اخلاقی خوشبوؤں میں بسے ہوئے ہیں۔

"شوکت! تم نے میرے لئے جان کی بازی لگا دی۔

”صفدر! تم نے میرے لئے اتنی بڑی تعلیمی سند کو سات روپے میں گروی رکھ دیا۔
”کمال صاحب! آپ نے میرے لالچی رشتہ داروں کو تیس ہزار دے کر مجھے آئندہ کے لیے بکنے سے بچالیا۔
”ایک نے جان دی..... دوسرے نے علم دیا....... اور تیسرے نے دولت...... اور انسان کی زندگی کے لیے یہ تینوں چیزیں لازمی ہیں۔ دنیا کی کوئی لڑکی میری جگہ بیٹھ کر ان حالات میں نہ تو کوئی فیصلہ کر سکتی ہے اور نہ ہی کسی سے آخری وعدہ کر سکتی ہے۔“

صفدر نے بڑی دیر بعد ایک گہری سانس لے کر کہا۔

”تم ٹھیک کہتی ہو‘ یہ فیصلہ تم بھی نہیں کر سکتیں۔ میرا خیال ہے کہ اس سلسلہ میں خود ہمیں مردانہ حوصلے سے کام لینا ہوگا۔ یعنی ہم تینوں مل کر اپنے درمیان سے خود ہی ایک فرد کا انتخاب کر لیں۔ یہ بڑے حوصلے اور قربانی کی بات ہے کہ ہم میں سے دو آدمی اپنی مرضی سے حامی کو کسی تیسرے کی شریکِ حیات بنا دیں۔

”مجھے یقین ہے کہ حامی کو ہمارے فیصلے سے انکار نہیں ہوگا کیونکہ وہ ہم میں سے ہر ایک کی عزت کرتی ہیں۔“

حامی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے صفدر کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا اور کہا۔

”صفدر! تم نے مجھے بہت بڑی دشواری سے بچا لیا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ میں کسی بھی فرد کی طرف سے بے وفائی کا الزام نہیں اٹھانا چاہتی۔ میری تقدیر کا فیصلہ آپ ہی لوگوں کی زبان سے ہو جائے تو بہتر ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے تینوں کی طرف سے رخ پھیر لیا۔ رخ پھیرتے ہی اس کی آنکھوں سے گہرے غم کا اظہار ہونے لگا۔ اس نے ہونٹوں کو یوں سختی سے بھینچ لیا جیسے دل سے نکلنے والی آہوں کا راستہ روک رہی ہو۔ پھر وہ تیزی سے زینے طے کرتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی اور بستر پر اوندھے منہ گر کر رونے لگی۔

وہ کس کے لئے رو رہی تھی؟

کس کے لیے تڑپ رہی تھی؟

اس دنیا میں اپنی خوبصورتی اور اپنے اخلاق سے متاثر کرنے والے بہت سے مرد ہوتے ہیں لیکن عورت کسی کا ایک انتخاب کرتی ہے۔

حامی کا دل بھی کسی ایک کے لیے تڑپ رہا تھا مگر باقی دو کے خلوص اور احسانات کے سامنے وہ زبان نہیں کھول سکتی تھی۔ ان کے احسانات کا صلہ یہ تو نہیں تھا کہ وہ ان کا دل توڑ دیتی؟ وہ عجیب کشمکش و پیچ میں تھی۔ زندگی میں جب بھی اس نے اپنی مرضی سے فیصلہ کرنا چاہا‘ تقدیر اسے دوسری طرف موڑ کر لے گئی۔ اسی لئے آج اس نے فیصلہ نہیں کیا‘ خود کو تقدیر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ اب دیکھنا یہی تھا کہ وقت کا بہاؤ اسے کس کی طرف لے جاتا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک ملازم نے آ کر کہا۔

”بی بی جی! صاحب آپ کو ڈرائنگ روم میں یاد کر رہے ہیں۔“

حامی کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ کیا وہ تینوں کسی ایک فیصلے پر متفق ہو گئے ہیں؟ کیا انہوں نے اس کے جیون ساتھی کا انتخاب کر لیا ہے؟

وہ جیون ساتھی کون ہے؟

اس نے آنسو پونچھتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا۔ ملازمہ جا چکی تھی۔ وہ ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے دروازے تک آئی۔ کمرے سے باہر اوپری برآمدے میں آ کر اس نے جھجکتے ہوئے نیچے ڈرائنگ روم کی طرف دیکھا۔

لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ ملازمہ نے تو یہی کہا تھا کہ صاحب ڈرائنگ روم میں بلا رہے ہیں مگر وہاں کمال صاحب تھے نہ شوکت تھا اور نہ ہی صفدر!

وہ تیزی سے زینے طے کرتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آئی اور چاروں طرف دیکھنے لگی۔ تینوں اس طرح غائب ہو گئے تھے جیسے ان کا وجود ہی نہ رہا ہو۔

پھر حامی کی نظر صوفوں کے درمیان رکھی ہوئی میز پر گئی۔ وہاں ایک گلدان کے نیچے ایک کھلا ہوا کاغذ رکھا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر کاغذ کو اٹھا لیا۔

کاغذ پر لکھا تھا۔

حامی!

اس الجھے ہوئے مسئلہ کا حل تقدیر ہی پیش کر سکتی ہے۔ آؤ ہم تقدیر کا فیصلہ دیکھیں۔ زینے کے ایک طرف تین کمرے ہیں۔ ایک کمرے میں شوکت ہے‘ دوسرے کمرے میں صفدر اور تیسرے میں

کمال۔ تم نہیں جانتیں کہ کون کس کمرے میں ہے۔ لہٰذا تم جس کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو جاؤ گی' اسی کمرے کا خوش نصیب نوجوان تمہاری زندگی کا ساتھی بن جائے گا۔

آگے بڑھو۔ ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ تقدیر تمہیں کس کے دروازے تک لے جاتی ہے۔

راقم الحروف

ش۔ ص۔ ک

حامی نے گھوم کر ان تین کمروں کو دیکھا۔ تینوں کے دروازے بند تھے۔ وہ کس طرف جائے؟ وہ پریشان ہو کر باری باری ہر کمرے کی طرف دیکھنے لگی۔

وہ پس و پیش کی حالت میں دوسرے کمرے کی طرف بڑھی مگر پھر رک گئی۔ دل نے کہا۔ نہیں' اس کمرے میں نہیں.......

وہ تیسرے کمرے کی طرف بڑھی۔ شانے سے ڈھلکا ہوا دوپٹہ پاؤں سے الجھ گیا اور وہ لڑکھڑا گئی۔ نہیں...... اس کے دل نے کہا۔ یہاں بھی نہیں.....

اس نے پہلے کمرے کی طرف دیکھا۔ شاید اسی کمرے میں وہ ہے جس کے لیے دل دھڑکتا ہے۔

وہ آگے بڑھی۔ ایک قدم...... دو قدم...... تین قدم...... پہلے کمرے کے دروازے کے ٹھیک سامنے آگئی۔ اسی وقت دو بلیاں آپس میں لڑتی ہوئیں زینے پر سے گریں پھر ایک بلی دروازے کے سامنے سے راستہ کاٹتی ہوئی گزر گئی۔

حامی گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہو گئی۔ نہیں...... یہ کمرہ بھی نہیں۔

آخر وہ جان حیات کس کمرے میں ہے۔ وہ پریشان ہو کر پھر ایک ایک کمرے کو یوں تکنے لگی جیسے نگاہوں کی زبان سے اپنی محبت کو پکار رہی ہو۔

"میرے اللہ! میں نے زندگی میں بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ آج میری یہ مشکل آسان کر دے۔ تقدیر کا فیصلہ اندھا ہوتا ہے۔ مگر تیرے فیصلے میں اندھیر نہیں ہوتا۔ آج میں تجھ پر اعتماد کر کے اندھی چال چلتی ہوں۔ تو میرے قدموں کو اس کے دروازے تک لے جا....."

حامی نے اپنا دوپٹہ لے کر اپنی آنکھوں پر باندھ لیا۔

آنکھیں بند ہو گئیں۔ اب کوئی دروازہ اس کے سامنے نہیں تھا۔ آنکھوں کے سامنے صرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ پھر وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر گول چکر لگانے لگی۔ اندھیرا گھومنے لگا۔ دائیں سے بائیں تاریکی میں چکرانے لگی۔ نازک سے ننگے پاؤں ادھر سے ادھر دائرے بنانے لگے۔

وہ چکرا رہی تھی۔ وہ بھٹک رہی تھی۔ اسے خود نہیں معلوم تھا کہ وہ کس طرف جا رہی ہے۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس اندھے راستے پر جہاں تھک کر گر جائے گی۔ اس کو اپنی منزل سمجھ لے گی۔

پھر وہ ہانپنے لگی' تھکنے لگی۔ اس کے پاؤں کانپنے لگے۔ جیسے کوئی رقاصہ ناچتے ناچتے سُر تال کی بلندیوں پر لرز رہی ہو۔ پھر اس کا سر چکرا گیا اور وہ دھڑام سے ایک دروازے پر گر پڑی۔

دروازہ کھل گیا۔ وہ آدھی کمرے کے اندر پڑی تھی اور آدھی باہر۔ کون ہے اس کمرے کا مکیں؟ وہ آئے اور آ کر تھام لے۔ میں تو اندھے راستے پر چلتی ہوئی یہاں تک آ گئی ہوں۔

وہ فرش پر پڑی ہوئی ہانپتی رہی لیکن کوئی اس کے قریب نہ آیا۔ وہ رونے لگی۔

"میں اندھی ہوں۔ مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں کہ آنکھوں سے پٹی کھول کر تقدیر کے فیصلے کو دیکھ سکوں۔ آؤ میری آنکھوں سے پٹی کھول کر دکھاؤ کہ دس ہزار' پندرہ ہزار اور تیس ہزار میں بکنے والی لڑکی کو تقدیر نے کس کے دروازے پر لا کر پھینکا ہے؟

"خاموش کیوں ہو' میرے گونگے طلبگار! آگے کیوں نہیں بڑھتے' میری آنکھوں سے پردہ کیوں نہیں ہٹاتے؟ میں تو بے وفائی کے الزام سے ڈرتی رہی' تم کس الزام سے ڈر رہے ہو؟"

"کیا بات ہے؟" شوکت کی آواز آئی۔

"کیا ہو گیا؟ صفدر کہاں ہے؟" کمال کی آواز آئی۔

حامی نے ایک جھٹکے سے اپنی آنکھوں کی پٹی ہٹائی۔ کمال اور شوکت کمرے کے باہر کھڑے تھے اور اندر کمرے میں کوئی نہیں تھا۔

"وہ کہاں ہیں؟" حامی فرش پر سے اٹھ گئی۔

"پتہ نہیں!" شوکت نے کہا۔ "یہ کمرہ تو صفدر صاحب کا تھا۔"

حامی کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔

☆-----------☆-----------☆
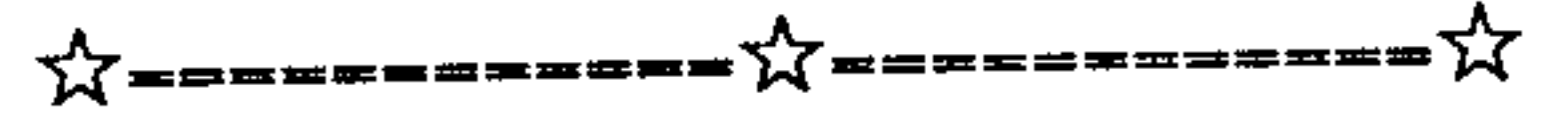
لاری اڈے پر خاصی چہل پہل تھی۔

سترہ سو ستائیس جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ عثمان نے صفدر کو دیکھتے ہی چیخ کر کہا۔

"ارے صفدر بھائی! کیا پھر سات روپے میں گروی رکھنے آیا ہے؟"

صفدر نے بس پر چڑھتے ہوئے کہا۔

"نہیں...... آج میرے پاس کرایہ ہے۔"

"یار میرے کو بولنے کا بیماری ہے۔ تو خیال نئی کرے گا ہاں۔ ذرا یہ تو بتا' وہ میرا ہونے والا بھائی کدھر میں ہے۔"

صفدر نے ایک سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"گزرے ہوئے وقت کی بات نہ پوچھو۔ بس یوں سمجھ لو کہ جیتی ہوئی بازی ہار کر آگیا ہوں۔"

"یار تیرے دماگ کا پتہ نئی چلتا۔ جس کے لئے وہ سالا یوسف سے لڑتا رہا' اس کو چھوڑ کے آگیا؟"

"ہاں!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "میں اس کے لیے دشمن سے لڑ سکتا ہوں' دوست سے نہیں۔ عثمان! تم ہی بتاؤ کیا تم ایک دوست کے گھر سے دوست کی خوشیوں کو چھین کر لا سکتے ہو؟"

"نہیں..... اپن تو دوست کے لیے جان بھی دے سکتا ہے۔"

"میں نے بھی جانِ حیات دے دی۔"

عثمان نے اس کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا۔

"سمجھ گیا بھائی سمجھ گیا۔ تو بھی اپنا مافق دل والا ہے۔ دینا جانتا ہے' لینا نہیں جانتا۔ جیو میرے یار!"

پھر اس نے دوسری طرف منہ گھما کر کہا۔

"چل بے لنگڑے۔ گاڑی بڑھا دے۔"

"اوئے تیرا خانہ خراب۔ تو نے پھر مجھے لنگڑا کہا؟"

گاڑی اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی۔ عثمان مسافروں سے ٹکٹ کے پیسے وصول کرنے لگا۔ صفدر کھڑکی سے لگا ہوا اداس بیٹھا تھا۔

گاڑی لاری اڈے کی حدود سے باہر آ گئی اور تیز رفتاری سے بھاگنے لگی۔ پیچھے کی تمام چیزیں پیچھے رہ گئیں۔ صفدر بھی اپنی تمام خوشیاں پیچھے پیچھے چھوڑتا جا رہا تھا۔

گاڑی منڈی سے آگے نکل گئی۔ صفدر نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر سوچا۔

"اب سب ختم ہو گیا۔ دوست اور محبوبہ۔ آرزو اور تمنائیں۔ سب کی سب پیچھے رہ گئیں۔ اب زندگی کے راستے پر میں تنہا ہوں......"

راوی پل کے قریب پہنچ کر عثمان نے بس کی باڈی پر زور سے ہاتھ مارا۔

"لنگڑے' ذرا روک کے۔ ایک پسنجر ہے۔"

بس رک گئی۔

عثمان نے خوشی سے چیخ کر کہا۔

"وہ مارا۔ آ جاؤ بھابی آ جاؤ۔ اپنا صفدر بھائی ادھر میں ہے۔"

صفدر اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ دروازے پر حامی کھڑی ہوئی تھی۔

"تم..... یہاں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

حامی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے چلتی ہوئی اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

عثمان نے بس کی باڈی پر ہاتھ مار کر کہا۔